جلد ۲۷ عدد ۱ جولائی ۵۷
July '57
جلد ۱ عدد ۱ جولائی ۵۸
Courtesy: Aditya Behl

نگار

سالانہ چندہ (مع سالنامہ)

	قیمت فی کاپی
و پاکستان	ہندوستان / پاکستان
آٹھ روپیہ بارہ آنہ	۶۹ پیسے / ۱۱ر
آٹھ روپیہ ۲۵ پیسے	

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہی اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہی کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہی۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا، ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہی۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت (علاوہ محصول)

من ویزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک عنبر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہی جس میں نہ مذہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی، اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہی قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ بجز (علاوہ محصول)

مجموعۂ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہی ان کی مختصر فہرست یہ ہی (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہی یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ہاروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ۔ ضخامت ۲۶۲ صفحات کاغذ سفید و بیز قیمت پانچ روپے آٹھ آنہ۔

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشار لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا، اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشار نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہی۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ مختصر تبصرہ کیا گیا ہی کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے، نیا اڈیشن۔ قیمت چار روپیہ۔

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گمشدہ فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مانوین کا مذہب نہایت دلچسپ و مفید کتاب ہی قیمت (علاوہ محصول)

آپ جیسے اچھے لوگوں کے ساتھ کاروبار کرنا ہماری خوش نصیبی ہے..!

اسی لئے ہمیں آپ کے ساتھ ایک گہرا لگاؤ ہے! سال بھر ہمارا مارکیٹ ریسرچ ڈیپارٹمنٹ آپ کی پسند ناپسند، عادتیں اور مزاج، خریدنے یا نہ خریدنے کی وجہ کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا ہے۔

شہر بہ شہر گھومتے ہوئے ہمارے نمائندے آپ سے ملکر آپ کی نئی اور بدلتی ہوئی ضرورتوں کا پتہ لگاتے رہتے ہیں۔ انہی کی اطلاعات کے بموجب ہم نے آپ کو رِنسو جیسی نئی مصنوعات دیں اور مکس ٹائلیٹ صابن کی خوشبو بدلی۔

ہماری بہت سی مصنوعات آپ کے گھر میں استعمال ہوتی ہوں گی اور ہمارے نقشوں اور نمائندوں کی تحریروں میں آپ کا نام بھی ہوگا، لیکن ہمارے نزدیک آپ کی قیمت ان نقشوں اور اعداد و شمار سے کہیں زیادہ ہے کیوں کہ آپ ہمارے خریدار ہیں! آپ کے پیسوں کے بدلے آپ کو اعلیٰ ترین مصنوعات دینا ہمارا آدرش ہے، اسی لئے ہماری سدا یہی کوشش ہوتی ہے کہ ہماری مصنوعات سے آپ کی ہر مانگ کی پوری تسلی ہو!

ہندوستان لیور

گھر کے کام آتا ہے

LI
070
NIES N-1/1957

نئی کرنسی اور ڈاک کے نئے ٹکٹ کی وجہ سے

"نگار" کے سالانہ چندہ میں خفیف سا اضافہ

نئے سکوں اور ڈاک کے نئے ٹکٹوں کا جو اثر رسایل و جرایدپر پڑا ہے اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ اس سے قبل پیسہ پیسہ والے ٹکٹ (جو دس تولہ وزن تک اخباروں اور رسالوں پر لگائے جاتے تھے) روپیہ میں ۶۴ ملتے تھے لیکن اسی قیمت کے ٹکٹ اب روپیہ میں صرف ۵۰ ملیں گے اور اس طرح ہم کو سوا دو آنے زیادہ ادا کرنا پڑیں گے۔

اس کمی کو پورا کرنے کا طریقہ صرف یہی ہوسکتا ہے کہ اس نقصان کو ہم آپ سب مل کر پورا کریں اور تمام حسابی اُلجھنوں سے گزرنے کے بعد اس کی صرف ایک ہی صورت سمجھ میں آئی ہے اور وہ یہ کہ ایک کاپی کی قیمت میں ایک آنہ کا اضافہ کردیا جائے یعنی بجائے ۱۰ کے ۱۱ رقی کاپی اور سالانہ چندہ ۱۲ کی جگہ ۱۳ اس لئے وی، پی سالانہ آٹھ روپیہ ۸۰ پیسے میں روانہ ہوگا لیکن جو حضرات سالنامہ ذریعہ رجسٹری حاصل کرنا چاہیں گے انھیں ۲۵ پیسے زیادہ ادا کرنا پڑیں گے۔

پاکستان چونکہ پاکستان کا سکہ نہیں بدلا ہے اور وہاں وی۔پی نہیں جاسکتا اس لئے وہ اپنے سالانہ چندہ کے لئے ہمارے نمایندہ کو ۱۳ کا منی آرڈر روانہ فرمائیں (جس میں ۸ر مصارف رجسٹری سالنامہ بھی شامل ہیں) اور اگر پاکستانی ایجنٹوں سے ماہ بماہ کاپی خریدنا پسند کرتے ہیں تو ۱۱ رقی کاپی ادا کریں۔

نگار کے پچھلے پرچے اور سالنامے

ڈاک خانہ کے قواعد جدید کی رو سے اب ذریعۂ بک پوسٹ روانہ ہوں گے، یعنی ایک پیسہ یا دو پیسے فی کاپی کی جگہ ایک آنہ فی چھٹانک کے کے حساب سے محصول ادا کرنا ہوگا اور ۲ر فیس رجسٹری وی پی اس کے علاوہ ادا کئے جائیں گے، اس لئے ہم پچھلے سالناموں کی قیمت میں ۴ رقی کاپی کا اضافہ کرنے پر مجبور ہیں۔ اس صورت میں خریداران نگار سے صرف ۹ر فیس رجسٹری لئے جائیں گے اور بک پوسٹ کے مصارف ہم ادا کریں گے یعنی جس سالنامہ کی قیمت دو روپیہ ہے وہ اب ۲۱ میں اور جس کی قیمت تین روپیہ ہے وہ ۳۱ میں وی، پی کیا جائے گا۔

سالنامہ ۵۸ء

معلومات نمبر ہوگا

کیونکہ اس وقت تک قارئین نگار کی اکثریت یہی چاہتی ہے کہ آیندہ سالنامہ "**معلومات نمبر**" ہو - یہ سالنامہ سیکڑوں علمی، تاریخی، ادبی، تنقیدی معلومات کا مجموعہ ہوگا اور غیر خریداران نگار سے اس کی قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول ڈاک) لی جائے گی ——— مزید تفصیل آیندہ اشاعت میں ملاحظہ ہو۔

منیجر نگار لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا ——— قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں)

توزک جہانگیری (ٹائپ) کامل ... ۳۰ھ
تاریخ گلستانِ ہند۔ مصور ... ۳۰ھ
درۂ نادرہ ... محمد مہدی خاں ... ۱۴ھ
تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ... ۴ھ
تاریخ فرشتہ ۲ حصے ... محمد قاسم ... ۵۰ھ
تذکرہ گلستانِ مسرت ... عبدالرحمٰن ... ۲۳۰ھ
تذکرہ علمائے ہند ... رحمٰن علی ... ۲ھ
تذکرہ شوکت نادری ... ۳ھ
دبستان المذاہب ... مرزا محسن ... ۱۵۰ھ
قصایدِ عرفی مختشی ... جمال الدین ... ۳ھ
دیوان ظہیر ... فاریابی ... ۳ھ
دیوان ناصر علی سرہندی ... ۶ھ
دیوان ہلالی ... للعہ
حدیقہ حکیم سنائی ... ۲۳۰ھ
دیوانِ حافظ مختشی ... ۴ھ
کلیات غالب ... اسداللہ خاں ... ۱۸۰ھ
خونابۂ جگر ... غلام غوث خاں بیخبر ... ۴ھ
دیوان ظہوری ... نورالدین ... ۱۵۰ھ
دیوان صائب ... مرزا محمد علی ... ۳ھ
کلیات سعدی شیرازی ... ۱۵۰ھ
کلیات جلال امیر ... ۱۵۰ھ
دیوان واعظ ... ملا رفیع واعظ کاشفی ... للعہ
دیوانِ کلیم ... ابوطالب کلیم ... ۲۵۰ھ
دیوان شوکت ... ۱۵۰ھ
دیوانِ فطرت ... ۱۵۰ھ
دیوان میلی ... ۱۵۰ھ

ہفت پیکر ... مولانا نظامی ... ۷ھ
ہشت بہشت ... ۳ھ
مثنوی قران السعدین ... امیر خسرو ... ۵ھ
ہفت قلزم کامل ... قبول محمد ... ۵۰ھ
غیاث اللغات مع چراغ ہدایت ... ۱۴۰ھ
مصطلحات الشعراء وارستہ ... ۵ھ
منتخب اللغات ... عبدالرشید ... ۱۴۰ھ
دریائے لطافت ... انشاء اللہ خاں ... ۴ھ
فرہنگ جہانگیری ۲ حصے کامل ... ۳۵۰ھ
بہادر شاہ ظفر ... امیر احمد علوی ... ۵ھ
مشاہیر اسلام ۲ جلد ... ۱۵۰ھ
سیرۃ النعمان ... شبلی نعمانی ... ۵ھ
حیات خسرو ... " ... ۱۲۰ھ
سوانح مولانا روم " ... ۴ھ
حیات سعدی ... الطاف حسین ... ۵ھ
تذکرۂ ہندو شعراء ... عبدالرؤف عشرت ۳ھ
تذکرۂ آبِ بقا ... " ... للعہ
تذکرۂ آبِ حیات ... محمد حسین آزاد ... ۹۰ھ
تذکرۂ شمیم سخن تذکرہ شاعرات ... ۳ھ
تذکرۃ الخواتین ... ۳ھ
حور مقصورات ... افتخار عالم ... ۲ھ
گلکدہ ... محمد ہادی عزیز ... ۳ھ
دیوان ناسخ ۲ حصے ... امام بخش ناسخ ... ۱۵۰ھ
دیوانِ ذوق ... شیخ ابراہیم ... ۲ھ
مجموعۂ قصاید ذوق ۔ مع ترجمہ ... للعہ
دیوان درد ... میر درد ... ۲ھ

آیاتِ وجدانی ... مرزا یگانہ ... ۴ھ
مرقع چغتائی ۔ دیوانِ غالب مصور ... ۹۰ھ
باقیات فانی ... للعہ
آفتاب داغ ... نواب مرزا ... ۳ھ
گلزار داغ ... " ... ۱۰۰ھ
انتخاب داغ ... " ... ۶ھ
دیوان ولی معہ دیباچہ حیدر ابراہیم ... ۳ھ
تاج سخن ... جلیل مانکپوری ... ۴ھ
دیوانِ ذوق ... محمد حسین آزاد ... ۴ھ
مقدمہ شعر و شاعری و دیوان حالی ... ۴ھ
مرأت الغیب ... امیر احمد مینائی ... ۴ھ
دیوان قلق ... ارشد علی خاں ... ۵ھ
دیوان شہیدی ... کرامت علی ... ۶ھ
صنمخانۂ عشق ... امیر مینائی ... ۴ھ
دیوان امیر اللہ تسلیم ... ۵ھ
دیوان مجروح ... میر مہدی ... ۵ھ
غنچۂ آرزو ... میر وزیر علی صبا ... ۱۵۰ھ
مثنوی مہر حسن ... میر حسن ... ۸ھ
مثنوی گلزار نسیم ... دیا شنکر ... ۵ھ
مثنوی ترانۂ شوق ... احمد علی ... للعہ
منتخب النفایس ... محبوب علی ... ۵ھ
لغات کشوری ... ۱۲۰ھ
عود ہندی ... اسداللہ خاں ... ۳ھ
موازنہ انیس و دبیر ... شبلی ... ۴ھ
رسایل شبلی ... ۵ھ
مکاتیب امیر مینائی ... احسن اللہ خاں ۔ ۹۰ھ

پاکستان میں یہ کتابیں صرف اس صورت سے پہونچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ بنک ڈرافٹ پہلے یہاں وصول ہو جائے۔

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپکا چندہ جولائی میں ختم ہوگیا اور اگست کا پرچہ وی پی روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۷۲ | فہرست مضامین جولائی ۱۹۵۷ء | شمار ۱

ملاحظات ۴
فانی ایک فنکار کی حیثیت سے ..... کبیر احمد جائسی ... ۶
ناول میں حقیقت پسندی ..... سید حامد حسین ایم۔ اے ... ۲۶
مجاز کے شعری رجحانات ..... شعیب راہی ۳۰
مشاعرۂ نگار ۳۵
گاہے گاہے باز خواں ! ۴۵
مشکلات غالب ۴۹
کس کا شعر ہے ؟ ۵۳
منظومات :- فضا ابن فیضی، شفقت کاظمی، آصف عارفی، شاد عیر ٹھی، غنی احمد غنی، اختر تلہری، سعادت نظیر، مضطر حیدری ۵۴

ملاحظات

کچھ اپنے متعلق میں ۲۲ کو بھوپال سے لکھنؤ واپس آیا اور بعض ایسے روح فرسا افکار میں مبتلا ہوگیا کہ اگر ان کا سلسلہ اس وقت تک قایم رہتا تو غالباً میں ختم ہو چکا ہوتا۔ ہر چند یہ دور ابتلا اب ختم ہو رہا ہے، لیکن پچھلے دو تین ہفتوں میں میرا خون جتنا خشک ہو چکا ہے، اس کو پھر قطرہ قطرہ جمع کرنے کے لئے اور میرے جسم کے جتنے ریشے ٹوٹ چکے ہیں ان کو پھر جوڑنے کے لئے (اگر وہ جڑ سکے) میں نہیں کہہ سکتا مجھے اور کتنا جینا پڑے گا۔

میں اپنے ذاتی معاملات میں کچھ لکھنا کبھی پسند نہیں کرتا، لیکن اشارتاً اس کا ذکر اس لئے ضروری تھا کہ اگر موجودہ اشاعت میں کسی بات کی کمی رہ گئی ہو تو آپ اسے میری مجبوری پر محمول فرما کر معاف فرما دیجئے۔

مشرق وسطیٰ مشرق وسطیٰ کی سیاست نے اس دوران میں جو جو پلٹے کھائے ہیں، وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس مسئلہ پر معاصر مدینہ نے اپنی تازہ ترین اشاعت میں بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے، اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:-

ابھی کل تک خاندان سعود، خاندان ہاشمی کے خون کا پیاسا تھا، لیکن اب جو ہوا کا رخ بدلا تو قدیمی دشمن قریبی دوست ہوگئے۔ عراق کے شاہ فیصل اردن کے شاہ حسین اور حجاز کے شاہ سعود میں دوستی و محبت کے رشتے استوار ہوئے اور بہت جلد یہ معلوم ہوگیا کہ شاہیت کی بقا کے سوال نے تینوں کو ایک مرکز پر لاکر کھڑا کر دیا ہے۔ مصر اور شام جہاں سے شاہیت کا جنازہ نکل چکا ہے، جو اپنے ہی ملکوں کو نہیں بلکہ ساری دنیائے عرب کو متحد کر کے استعمار کے پنجہ سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ آج ان شاہوں کو دشمن نظر آتے ہیں اور یہ شاہ اپنے نفس کی خاطر فریب کا حسین سے حسین جال بچھا کر جاہل اور غریب عوام کو استعمار کے قدموں پر ڈالے رکھنا چاہتے ہیں۔ ابھی شاہ سعود اور اردن کے شاہ حسین کی ملاقات کے بعد جو مشترکہ اعلانیہ شایع ہوا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ :-

"دونوں ممالک مثبت غیر جانبداری کی پالیسی پر قایم رہیں گے ۔
دونوں ممالک بیرونی معاہدوں اور گٹھ جوڑوں میں شمولیت سے احتراز کریں گے ۔ خواہ وہ کسی بھی نوعیت کے ہوں ۔
عرب ممالک کا دفاع خود عرب ممالک کی ذمہ داری ہونا چاہیئے ۔

دونوں شاہوں نے اس بات پر زور دیا کہ وہ قائم رہیں گے عرب لیگ کے منشور، اقوام متحدہ کے منشور، عربوں کے اجتماعی تحفظ کے معاہدہ اور ان تجاویز پر جو عرب کی بڑی طاقتوں نے گزشتہ فروری میں قاہرہ میں منظور کی تھیں ۔ نیز ان تمام تجاویز کی پابندی کریں گے جو بنڈونگ کی ایشیائی افریقی کانفرنس نے منظور کی تھیں ۔

اُنھوں نے طے کیا کہ وہ عرب ریاستوں کے مابین اپنے سب کے دشمن کے خلاف فوجی تعاون کی حمایت کریں گے (اُن معاہدوں کے مطابق جو آپس میں پہلے ہی ہو چکے ہیں) اُنھوں نے فلسطین پر عربوں کے مکمل حقوق کی بھی حمایت کی ۔

غرض یہ کہ اس اعلان میں وہ تمام باتیں درج ہیں جو گزشتہ عرصہ میں وہ عرب عوام سے کہتے رہے ہیں اور عوام اب اُسی راہ پر چل پڑے ہیں ۔ اس مشترکہ اعلان سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ممالک آئزن ہاور پلان کو منظور کرنے کے حق میں نہیں ہیں ۔ لیکن اردن، شام اور مصر کے ساتھ تعلقات میں جس طرح حال ہی میں کھچاؤ پیدا ہو گیا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ سطح کے نیچے کوئی اور لاوا جوش کھا رہا ہے ۔ اردن والے شام اور مصر پر الزامات لگا رہے ہیں، اور مصر، اردن اور سعودی عرب پر، شام کے وزیر دفاع ڈاکٹر خالدی نے ایک بیان میں کہا کہ :-

"سعود حسین مشترکہ اعلانیہ میں مثبت غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل پیرا رہنے کا ذکر محض مصر اور شام کو دھوکا دینے کے لئے کیا گیا ہے، ہم ہرگز دھوکے میں نہیں آئیں گے اور اردن کو مالی امداد نہ دیں گے ۔"

"مغربی ایشیا کی سیاست میں شاہ سعود کا موجودہ رول یہ ہے کہ وہ اس علاقہ میں امریکہ کی پالیسیوں کے لئے حمایت حاصل کر رہے ہیں"

"بلاشبہ شاہ سعود اور شاہ حسین کے مابین کچھ خفیہ معاہدات ہوئے ہیں جن کا ذکر مشترکہ اعلانیہ میں نہیں کیا گیا ہے ۔"

ڈاکٹر خالدی ایک ذمہ دار حکومت کے ذمہ دار وزیر ہیں اور وہ بلا ثبوت کے دوسرے ملک کے سربراہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کہہ سکتے ۔ اُنھوں نے کافی انتظار اور حالات کی رفتار کا جایزہ لینے کے بعد شاہ سعود پر امریکہ کے پٹھو ہونے کا الزام لگایا ہے ۔ خفیہ معاہدات کا معاملہ اور بھی سنگین ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو مصر اور شام اپنے اقدام میں حق بجانب ہیں ۔ مصر اور اردن نے ایک دوسرے کے ملک میں اپنے سفارت خانے بند کر دیئے ہیں سفارت خانے بند کر دینے کا مطلب یہی لیا جا سکتا ہے کہ اردن اور مصر کے تعلقات بالکل ٹوٹ گئے ہیں ۔ ڈاکٹر خالدی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ مصر اور شام کو اس بات کا پختہ یقین ہے کہ اردن مغربی بلاک میں چلا گیا ہے ۔ اگر ان کو اس بات کا پختہ یقین نہ ہوتا تو وہ کوئی ایسا اقدام نہ کرتے جس سے حالات نازک تر ہو جاتے ۔ مثلاً اردن کو امداد دینے سے انکار یا سفارت خانہ کو بند کرنا

شاہ سعود کو اسلامی دنیا میں ایک خاص عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ اگرچہ عرب لیگ کے ممبران ہمیشہ سے ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں لیکن اب تک ایک دوسرے پر ان میں سے کسی نے اتنے سنگین الزامات نہیں لگائے تھے ۔ شاہ سعود اگر اسلامی دنیا کے سامنے یہ ثابت نہ کر سکے کہ خفیہ معاہدات نہیں ہوئے ہیں ۔ یا وہ قاہرہ کانفرنس کے اس فیصلہ کے برخلاف کہ عرب ممالک مثبت غیر جانبداری کی پالیسی پر قایم رہیں گے امریکہ کے حق میں فضا ہموار نہیں کر رہے ہیں تو ہمیں یقین ہے کہ اسلامی دنیا کو اُن کے بارے میں زبردست شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے ۔ آج جبکہ عربوں کے سب سے زیادہ متحد رہنے کی ضرورت تھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغربی سامراج کی چالیں اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں کامیاب ہو رہی ہیں ۔ عرب عوام اور عرب سربراہوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ عرب اتحاد ایک فرضی نعرہ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے جبکہ مغربی سامراج کے ترجمان مستقل کہتے تھے کہ عرب اتحاد ایک فرضی تخیل ہے ۔ لیکن اگر سعودی عرب کا رول صاف اور واضح طور پر دنیا کے سامنے نہ آیا تو مغربی ایشیا کی سیاست میں عنقریب زبردست بحران پیدا ہو جائے گا ۔ پرانی تاریخ پھر دہرائی جائے گی ۔ عرب پھر پستی میں چلے جائیں گے اور اس کی ذمہ داری کس پر ہوگی اس کا فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے ۔

فانیؔ ایک فنکار کی حیثیت سے

(کبیر احمد جائسی)

غالباً اس امر سے تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ غالبؔ کے بعد اقبالؔ اور فانیؔ ہی دو ایسی شاعرانہ ہستیاں ہیں جن کا کلام ایک مکمل اور مربوط فلسفہ کا حامل ہے۔ جن کے یہاں کائنات اور اس کے اسرار کو سمجھنے اور سمجھانے کا جذبہ ہے۔ طوفانوں سے ٹکرا جانے کی خلش ہے، مصائب و آلام سے ہنس ہنس کر نباہ کرنے کا ولولہ ہے۔ زندگی کو نشاطِ دائمی سے ہم آغوش کرنے کی انتھک سعی بھی ہے اور سکونِ جاوداں کی تلاشِ متصل بھی۔ یہی نہیں بلکہ ہر دو حضرات کا کلام نفسیاتِ انسانی کے نشیب و فراز کی مکمل داستان ہے اس داستانِ سوز و ساز میں زندگی کی نیرنگیاں بھی ہیں اور محرومیاں بھی۔ شورہائے و ہو بھی ہے اور نالہ و فریاد بھی۔ نغمۂ بربط و چنگ بھی ہے اور سازِ شکستہ کی جھنکار بھی۔ ان حقایق سے قطع نظر ہمارے ناقدین ہر دو حضرات کے فلسفہ میں کچھ اس طرح اُلجھ کر رہ گئے ہیں کہ ان کے دل سے یہ حقیقت محو ہو گئی ہے کہ یہ حضرات شاعر بھی تھے۔ اس میں ہمارے ناقدین کا کچھ زیادہ قصور نہیں ہے بلکہ ہر دو حضرات نے اپنی شاعری کو کچھ ایسے لطیف پردوں میں چھپا دیا ہے جس کی جلوہ سامانیاں ہماری نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہیں اور ہم اسی کو جلوۂ مقصود سمجھ لیتے ہیں۔ دراصل یہ حضرات ہمارے ذوقِ نظر کا امتحان لینے کے لئے اپنی شاعری کو ان لطیف پردوں میں چھپا گئے ہیں کہ دیکھیں دانایانِ راز پردے کی رنگینیوں سے صرفِ نظر کر کے گوہرِ مقصود تک پہونچ پاتے ہیں یا نہیں؟ علامہ اقبالؔ مرحوم پر تو ایک فنکار کی حیثیت سے مجنوں گورکھپوری صاحب اور حضرت الاستاذ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے بہت کچھ لکھا ہے جس سے ایک حد تک آج تک کی غلطیوں کی تلافی ہو گئی ہے۔ مگر فانیؔ کا فلسفہ اقبالؔ کے فلسفہ سے زیادہ مخدوش ہے اس میں دو چار ایسے سخت مقام آتے ہیں جہاں ذی ہوش راہی بھی ٹھوکریں کھائے بغیر نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ناقدین ان کے فلسفہ کے تجزیہ ہی میں اُلجھے ہوئے ہیں اور کسی کی نگاہ اس پہلو پر نہیں جاتی کہ وہ بہت بڑے فنکار بھی تھے۔ آج تک فانیؔ پر بحیثیت ایک شاعر کے بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہ لکھنے کے برابر ہے راقم کو دانائے راز ہونے کا ادعا تو نہیں ہے مگر چونکہ راقم نے کلام فانیؔ کا ہر ہر پہلو سے مطالعہ کیا ہے اور کرتا رہتا ہے اسلئے فانیؔ کی شاعرانہ خوبیاں ناظرین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے۔ اگر ناظرین یہ جاننا چاہیں کہ میں فانیؔ کے فلسفہ سے کس قدر اور کس پہلو سے متاثر ہوں تو میرا مقالہ "فانیؔ میری نظر میں" دیکھ سکتے ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ میں فانیؔ کی فنکارانہ خصوصیات کی اجمالاً عکاسی کر رہا ہوں۔

ردیف و قافیہ اکثر ناقدین کا خیال ہے کہ ردیف و قوافی کی بندشیں شاعری کے لئے سمِ قاتل سے کم نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حالیؔ سے لیکر آج تک کے ناقدین نے ردیف و قوافی کی مذمت میں شد و مد کے ساتھ حصہ لیا ہے۔ ایک حد تک تو ان حضرات کا اعتراض بجا بھی ہے۔ مگر میرے نزدیک آرٹ کی خوبیوں کو پرکھنے کے لئے اور اُسے جلا دینے کے لئے کچھ بندشوں کا ہونا ناگزیر ہے ----- ان قیود کے باوجود جو شاعر اپنے جذبات کا فنکارانہ انداز سے اظہار کر جائے یعنی انداز بیان ایسا لطیف و شستہ ہو کہ اُس کی مقصدیت، اس کی زبان، اس کے جذبات مجروح نہ ہونے پائیں تو وہی شاعر در اصل بڑا فنکار کہلانے کا مستحق ہے۔ ان بندشوں کے علاوہ اگر ردیف و قوافی زیادہ مشکل ہیں تو قادر الکلام شاعر کا بھی اس زمین میں پھلنا پھولنا سخت دشوار ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ شعر اچھے اور صاف نکل آئیں ورنہ چند شعرا کو چھوڑ کر جن حضرات نے بھی سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے ان کی تمام کاوشیں کوہ کندن و کاہ برآوردن کی مصداق ہیں۔ فانیؔ کے کلام کا سب سے اہم اور تابناک پہلو یہی ہے کہ انھوں نے مشکل سے مشکل ردیف و قوافی

میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے ہاتھوں سے تغزل، لطفِ زبان اور ندرتِ ادا کا دامن نہیں چھوٹنے پاتا۔ اس خوبی کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بہ ایں قید و بند وہ اپنا مخصوص فلسفۂ حیات فنکارانہ انداز سے پیش کر جاتے ہیں۔ فانی کی شاعری کا یہ وہ مقام ہے جہاں تخیل سے بخیل اور متعصب سے متعصب ناقد بھی انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ جہاں جہاں بندشوں کی افراط ہوئی وہاں وہاں انکا قلم اور گوہر بار ہوگیا ہے اور ان کے سازِ شکستہ سے ایسے ایسے خوش کن نغمات پھوٹ نکلے ہیں کہ آج تک ہمارے دلوں کو گرمائے ہوئے ہیں۔ یہی وہ وادی ہے جہاں ان کے فن کی رنگینیاں اور رعنائیاں سمٹ سمٹا کر ایک دوسرے میں ضم ہو کر ہمارے سامنے ایک "دوسرے ہی عالم" کی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ان مثالوں سے ان کے معاصرین کی غزلوں کا موازنہ کر لیجیے۔ فانی کی فن کارانہ عظمت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی ع

موت فراقِ یار میں درپئے انقلاب ہے
نیند جو کل حرام تھی آج حلال ہوگئی

فرصتِ یک نظر کے بعد حوصلۂ دعائے وصل
اے دلِ قدر ناشناس اب وہ مجال ہوگئی

میری وفا جفا فروش گریہ تبسم آفریں
عشق کی ساری کائنات صرفِ جمال ہوگئی

حسن کی وہ لطافتیں عشق کی وہ نزاکتیں
ہائے وہ زندگی جو اب خواب و خیال ہوگئی

تو ہی سفر میں پاس ہے تو ہی حضر میں پاس ہے
تو ہی جنوں کا آسرا تو ہی سکوں کی آس ہے

وہم و قیاس کے سوا حاصلِ ہوش کچھ نہیں
فہم کی ابتدا ہے وہم عقل کی حد قیاس ہے

جو ہے شہید انتظار جو ہے ترا امیدوار
زیست بھی اس کی زیست ہے موت بھی اسکو راس ہے

حسنِ ستم نواز کی ایک نگاہِ غم نواز
اجر ہزار صبر ہے نازشِ صد سپاس ہے

فانی اس انقلاب سے وحشتِ عشق کی پناہ
آہ وہ بزمِ دل جو آج انجمنِ حواس ہے

ہوش کا سرمایہ وحشت کے سوا ممکن نہیں
عالم اک مجموعۂ ذراتِ صحرا بیز ہے

جلوہ کیا دیکھے کوئی قدرت کے فرصت کہاں[1]
یاں نقابِ جلوہ خود حسنِ تماشا ریز ہے

مایۂ ادراکِ ہستی ہوں تکلف برطرف
زندگی میری دروغِ مصلحت آمیز ہے

وقت اتنا کب بقدرِ فرصتِ یک سجدہ ہے
ہم ہیں اور عمرِ ابد اور حسرتِ یک سجدہ ہے

حاصلِ غفلت ہے تعمیرِ جبینِ سجدہ ریز
شانِ تکوینِ دو عالم دعوتِ یک سجدہ ہے

حاصلِ بیخبری لازمۂ ہوش ہوئی
یاد تیری کسی عنواں نہ فراموش ہوئی

سامنے آئیں جو ہوں دعوئے تقویٰ والے
چشمِ ساقی کی ادا میکدہ بردوش ہوئی

وہم ہستی کا بھی احساس نہیں تیرے بغیر
زندگی ہجر میں اک خواب فراموش ہوئی

خاکِ دل ہے عجب اضداد کی دنیا فانی
منزلِ عشق ہوئی جادہ گہِ ہوش ہوئی

افشاندنِ جاں جز بحضورِ تو روا نیست
در عہدِ غمِ ہجر تو آئینِ فنا نیست

نازم بجمالِ تو کہ برق ست و بلا نیست
سازم بہ غمِ عشق کہ در دست و دوا نیست

خوابانِ کرم نیست پرستارِ کریم است
فانی بدرت ناصیہ فرسا ست گدا نیست

حسن یک پرتوِ عشقیست کہ از ما خیزد
صنمے ساختہ ام برہمنے ساختہ ام

دہر خلوتگہِ اسرارِ نہاں ست و لے
از پئے دفعِ نظر انجمنے ساختہ ام

گنہے کردہ ام و عذر گنہ می بایست
حیلہ پرداختہ ام اہرمنے ساختہ ام

---

[1] کہاں کا استعمال غیر ضروری ہے بلکہ مصرع کے مناسب ہے۔ (نگار)

دریا کشودۂ بمن از فقر و از غنا — مائیم و شاد مردن و رنجور زیستن
کج کن کلاہِ خسروئ دل بہ رغم ہوش — سہل ست ہم چو قیصر و فغفور زیستن
طالعم گردشِ افلاک بسوخت — اخترِ مارہِ صد اختر زد،
شررِ عشق کہ شعرش نامند — زد دلم جست و بہ جانہا در زد،

مندرجۂ بالا امثال پر ہر ہر پہلو سے ناقدانہ نظر ڈال جایئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو شاعرانہ حیثیت سے کسی قسم کا سقم نہیں مل سکتا۔ ان اشعار میں تغزل بھی ہے اور لطفِ زبان بھی۔ ندرتِ بیان بھی ہے بلند پروازی بھی۔ حقایق کی عکاسی بھی ہے اور حکایتِ غم بھی۔ آپ چاہے جس غزل کا بھی تجزیہ کیجئے مندرجۂ بالا اوصاف کا دامن فانی کے ہاتھ سے کہیں بھی چھوٹتے نہ پایئے گا۔ مثال کے طور پر صرف ایک غزل کا تجزیہ پیش کر رہا ہوں اتفاق سے اسی ردیف و قافیہ میں غالب کی بھی غزل موجود ہے فرق اتنا ہے کہ بحر بدلی ہوئی ہے۔ اب ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ دونوں اساتذہ نے ایک ہی قافیہ کو کس کس انداز سے نظم کیا ہے، غالب کا مطلع ہے ؎

سرگشتگی میں عالمِ ہستی میں یاس ہے — تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

فانی کہتے ہیں کہ:

تو ہی سفر میں پاس ہے تو ہی حضر میں پاس ہے — تو ہی سکوں کا آسرا تو ہی جنوں کی آس ہے

دونوں اساتذہ کے مطلعے معانی کے لحاظ سے مختلف ہیں صرف قافیہ ثانی مشترک ہے۔ نیز فانی نے جو بحر منتخب کی ہے اس میں غالب کی بحر سے زیادہ روانی ہے۔ شعر کی تاثیر میں بحر کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ کریڈٹ فانی کو ملا ہے اور غالب اس سے محروم ہیں۔ غالب کا مطلع ان کے خاص اندازِ سخن سے جدا ہے اور اس کا شمار ان کے زیادہ اچھے اشعار میں نہیں ہے اس کے علاوہ مصرعۂ اول میں "میں" کی تکرار وجدان پر گراں گزر رہی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ فانی جو کہ قنوطیت پسند مشہور ہے اس کا مطلع ایک چھلکتا ہوا جام ہے جس سے نشاط و سرور کی کیفیتیں چھوٹی پڑ رہی ہیں۔ اس کے برعکس غالب کے مطلع میں ایک عجیب قسم کی غم آگیں فضا چھا گئی ہے جو ان کے خاص رنگ سے بالکل میل نہیں کھاتی۔ ویسے غالب کا مطلع بھی اچھا ہی ہے مگر وہ ان کی صحیح نمایندگی نہیں کر رہا ہے فانی کا مطلع اپنی بحر کی وجہ سے اپیلنگ ہو گیا ہے اور اس میں جن جذبات کی عکاسی کی گئی ہے اس کا قنوطیت سے کوئی علاقہ نہیں ہے اس کے علاوہ یہ جذبات فطرتِ انسانی کی بھی پردہ کشائی کرتے ہیں کہ عالمِ محویت کا ایک دور وہ بھی آتا ہے جب جلوۂ محبوب کے سوا ہر شے باطل ہو جاتی ہے۔ غرضکہ فانی کا مطلع پرسوز ہونے کے باوجود بلند آہنگ ہے اور غالب کا مطلع صرف پرسوز ہو گیا ہے غالب کا دوسرا شعر سنئے:۔

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر — اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

"پاس" کا قافیہ فانی کے یہاں مطلع میں آچکا ہے۔ اس قافیہ کا کوئی دوسرا شعر نہیں ہے۔ ویسے بھی غالب کے شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے صرف اپنے شاعرانہ انداز سے ایک چھوٹی سی بات کو حسین بنا گئے ہیں۔ اسی طرح غالب نے قیاس کا قافیہ نہیں باندھا ہے۔ فانی کا شعر اس قافیہ میں بہت ہی حسین ہے ملاحظہ ہو:۔

وہم و قیاس کے سوا حاصلِ ہوش کچھ نہیں — فہم کی ابتدا ہے وہم عقل کی حد قیاس ہے

یہ شعر نہیں بلکہ "ماورائے شعر" ہے۔ اور ان دو مصرعوں میں جو حقیقت بیان کر دی گئی ہے بڑے سے بڑا ناظم ایک طول طویل نظم میں بھی بیان نہیں کر سکتا۔ نہ ہی اس شان کا کوئی شعر غالب کی غزل میں موجود ہے۔

غالب کا قیاس شعر ہے:۔

کیجئے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک — ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے

فانی کا شعر ملاحظہ ہو جس میں پاس کا قافیہ باندھا گیا ہے:۔

حسنِ ستم نواز کی ایک نگاہِ غم نواز — اجر ہزار صبر ہے نازشِ صد سپاس ہے

غالب کے شعر میں مبالغہ ہی مبالغہ ہے اس سے تو انکار نہیں کہ شعر حسین ہے اور انسان کبھی کبھی یوں بھی محسوس کرتا ہے مگر اس کا یہ احساس واقعیت سے بہت دور ہوتا ہے جو ایک لطیف فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لطافتِ فریب سے تو مجالِ انکار نہیں مگر فریب بہر حال فریب ہی ہے۔ اس کے برعکس فانی کا شعر واقعیت کے سانچہ میں ڈھل کر نکلا ہے۔ اس شعر میں بھی سوز و گداز ہے جو حاصلِ حیاتِ انسانی کہلانے کا مستحق ہے۔ مگر یہ ایں سوز و گداز اس شعر میں بھی پسپائی کا عنصر کہیں سے بھی نہیں آنے پایا ہے۔ غالب کے شعر پر فانی کے شعر کو ترجیح دینے کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ غالب کا شعر واقعیت سے ہم آغوش نہیں ہے اس کے بالکل برعکس فانی نے واقعیت کی حسین عکاسی کی ہے جو کسی دوسرے شاعر سے ممکن نہیں ہے۔

غالب کا شعر ہے ؎

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر واقعی کسی کے پاس دلِ حق شناس ہے تو وہ حسن جیسی فانی چیز پہ اتنا نازاں کیسے ہو سکتا ہے کہ بیگانۂ وفا ہو جائے۔ وفا تو دلِ حق شناس کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کچھ دیر کے لئے صاحبِ حق شناس اس حقیقت کو بھلا دے۔ مگر میرے نزدیک یہ قطعی ناممکن ہے کہ دلِ حق شناس کے ہوتے ہوئے کوئی حسنِ دو روزہ پر اس طرح نازاں ہو کہ ہمیشہ کے لئے بیگانۂ رسم و وفا ہو جائے۔

"شناس" کا قافیہ فانی نے یوں باندھا ہے ؎

ترکِ خودی ہے ہوشِ عشق ترکِ خودی ہے جوشِ عشق خود نشناس و خود شناس جو ہے خدا شناس ہے

فانی کا شعر غالب کے شعر سے کہیں بلند ہے اور اس کی تشریح کی بھی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ یہ فرق پہلی ہی نظر میں واضح ہو جاتا ہے۔

غالب کا شعر ہے ؎

پی جس قدر ملی شبِ مہتاب میں شراب اب بعد مے مزاج کو گرمی ہی راس ہے

فانی کا شعر ہے ؎

جو ہے شہیدِ انتظار جو ہے ترا امیدوار زیست بھی اسکی زیست ہے موت بھی اسکو راس ہے

غالب کے شعر میں میری کو رنظری کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ اس شعر میں کوئی بہت بڑا فلسفہ بیان کیا گیا ہو جہاں تک میری نگاہ نامحرم نہیں پہونچ سکی ہے۔ اس کے برعکس فانی کا شعر ہمارے سامنے عشقِ حقیقی کی ایک تابناک و درخشاں تصویر کھینچ دیتا ہے۔ یہی وہ جذبات ہیں جو مصائب و آلام کی دشوار گزار گھاٹی میں ہماری رہبری کرتے ہیں ورنہ ہم تو کب کے یا تو خودکشی کر چکے ہوتے یا زیبِ صحرا ہوتے۔

غالب کا مقطع ہے ؎

ہر اک مکاں کو ہے مکیں سے شرف اسد مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

فانی کے یہاں اداس کا قافیہ بندھا تو ضرور ہے مگر نہایت ہی سست ہے، غالب کا یہ مقطع حاصلِ غزل ہے۔ بے جا نہ ہوگا اگر میں آپ کو فانی کا بھی مقطع سناتا چلوں کہتے ہیں ؎

فانی اس انقلاب سے وحشتِ عشق کی پناہ آہ وہ بزمِ دل جو آج انجمنِ عزا س ہے

یہ مقطع معنویت و نشتریت کے لحاظ سے غالب کے مقطع سے کسی طرح بھی کم رتبہ نہیں ہے۔

اس تجزیہ سے ناظرین یہ نہ سمجھ لیں کہ میں فانی کو غالب پر ترجیح دے رہا ہوں۔ غالب کی شاعرانہ عظمت سے تو مجھے مجالِ انکار نہیں۔ مگر یہاں پر مجھے یہ دکھانا مقصود تھا کہ غالب جیسا استاد جن ردیف و قوافی میں ٹھوکریں کھا کر سست اشعار نظم کر جاتا ہے انہیں ردیف و قوافی میں فانی کیسی کیسی گل افشانیاں کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ٹھوکریں بھی نہیں کھاتے۔ اگر فانی کے اشعار غالب کے ہم پایہ ہی ہوتے تب بھی میں ان کو

ایک عظیم فنکار سمجھتا اس لئے کہ غالب جیسے استاد کے مقابلہ میں کسی کا اس کے برابر کے اشعار پیش کر دینا ہی فنکارانہ معراج کی دلیل ہے۔ غرض کہ فانی ردیف و قوافی کی سخت بندشوں کے باوجود اپنے اشعار اس حسین انداز سے نظم کر جاتے ہیں جو ہمارے دل میں نشتر کی طرح سے اُتر جاتے ہیں یہ ان کے فنکارانہ عظمت کی پہلی دلیل ہے۔

جملوں کے اجزائے ترکیب

نشستِ الفاظ شاعری کا بہت بڑا حسن ہے جس سے صرف نظر کرنے پر تعقید جیسی شے اشعار سے ہم آغوش ہو جاتی ہے جو شاعری کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔ مگر بحر کی پابندی کی وجہ سے بڑے سے بڑے اور قادرالکلام سے قادرالکلام شاعر تعقید سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں۔ بعض اوقات بحر کی پابندی شاعر کو اس بات پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ الفاظ کی نشست میں تاخر و تقدم سے کام لے۔ مثلاً اگر "میرا ہے" کہنا مقصود ہے تو بحر کی پابندی کی وجہ سے "ہے میرا" نظم کرتا ہے۔ الفاظ کا یہ تاخر و تقدم اس حد تک تو روا ہے اور مندرجہ ذیل اشعار میں جملوں کے اجزائے ترکیبی نے انھیں چیستان بنا دیا ہے۔ مثلاً:

سر کو مر جائیں نہ ٹکرا کے اسیرانِ قفس — شور اتنا نہیں اے برگ خزاں لازم ہے
ذبح وہ کرتا تو ہے پر چاہیے اے مرغِ دل — دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیاد کا

پہلے شعر کے پہلے مصرع میں نشستِ الفاظ کی خرابی کی وجہ سے مصرع بہت بعید ہو گیا ہے۔ بقول سید مسعود حسن صاحب رضوی مصرع اصل میں یوں رہا ہوگا۔ "سر کو ٹکرا کے نہ مر جائیں اسیرانِ قفس" — اور موجودہ صورت حضرتِ کاتب کی رہینِ منت ہے۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرع سے سخت قسم کا دھوکا ہوتا ہے۔ بظاہر شعر کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے:۔ "صیاد کا تڑپنا دیکھ کر مرغِ دل کا دم پھڑک جائے" مگر شعر کا مطلب یہ نہیں بلکہ یہ ہے:۔ "اے مرغِ دل اس طرح تڑپ کہ تیرا تڑپنا دیکھ کر صیاد کا دم پھڑک جائے۔" یہ تعقید یا پیچیدگی الفاظ کے تاخر و تقدیم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کو تھوڑی سی کاوش کے بعد دور کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں پیشِ نظر ہیں مگر خوفِ طوالت سے ان سے صرفِ نظر کرتا ہوں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی بات اس انداز سے کہے کہ ذہنِ انسانی کسی خاص کد و کاوش کے بغیر اس کے معنی تک پہونچ جائے خواہ بات کتنی بلند کیوں نہ کہی جائے۔ مگر الفاظ کا انتخاب اور ان کی نشست اس انداز سے ہونی چاہئے کہ عامی سے عامی اُسے بہ آسانی سمجھ لے۔ فانی کے کلام کا زیادہ تر حصہ اسی حسنِ الفاظ و نشستِ الفاظ کی وجہ سے فنِ شاعری کی بہترین مثال بن گیا ہے۔ فنِ شاعری کا یہ وہ وصف ہے جس کا بڑے سے بڑا ناقد قدرداں رہا ہے، علامہ شبلی مرحوم نے سعدی کا جو وصف بتایا ہے وہ یہی ہے اور یہی وصف ان کی شاعری کو دوسرے شعرائے ایران سے ممتاز بنا دیتا ہے، بہرحال فانی نے اس صنعت کا نہایت ہی فنکارانہ انداز سے استعمال کیا ہے۔ خواہ وہ فلسفیانہ اشعار ہوں یا رندانہ۔ ان کے بیشتر اشعار میں شعوری یا لاشعوری طور پر اس صنعت کا استعمال ہوا ہے جس کی وجہ سے تر ان کے کلام کا جزوِ اعظم بن گیا ہے۔ مجھے تو یہاں تک کہنے میں بھی کوئی باک نہیں ہے کہ اگر اس صنعت میں ڈاکٹر اقبال کا کوئی حریف و مقابل ہے تو وہ فانی اور صرف فانی ہیں۔ فانی کے کلام میں جتنی بھی سلاست، روانی اور ترنم ہے وہ سب اسی صنعت کا رہینِ منت ہے اگر فانی اس صنعت سے صرفِ نظر کر لیتے تو مشکل ہی سے چند حضرات ان کے کلام کے سمجھنے والے نکل سکتے تھے کیونکہ انھوں نے اپنی شاعری میں جن فلسفیانہ مسائل کو جگہ دی ہے وہ عام ذوق کی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ اس مادی اور مشینی دور میں کس کو اتنی فرصت ہے کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ اس کی زندگی کا کیا مقصد ہے؟ وہ اس دنیا میں کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اس کی حیثیت اس کائنات میں کیا ہے؟ آج تو انسان بس رواں میں خس و خاشاک کی طرح بہا جاتا ہے۔ زمانہ کی رو اُسے جدھر لے جاتی ہے ادھر جاتا ہے۔ اچھا ہوا کہ فانی نے اپنے فلسفہ کو عام فہم اور رنگین انداز سے پیش کیا ورنہ اس دور میں ان کا کوئی نام لیوا نہ ہوتا۔ اب کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔ ان اشعار میں فانی کے نشستِ الفاظ پر خاص طور سے نظر رکھیں اور اس بات پر بھی کہ زیادہ تر مصرعے ایسے ہیں جن کی نثر نہیں کی جا سکتی۔ ۶

ہے ذوقِ نظر و بزمِ تماشا نہ رہے گی — منہ پھیر لیا میں نے تو دنیا نہ رہے گی
یہ دردِ محبت غمِ دنیا تو نہیں ہے — اب موت بھی جینے کا سہارا نہ رہے گی

جینے کی ہے امید نہ مرنے کا یقیں ہے
اب دل کا یہ عالم ہے نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

ایذا کے سوا لذتِ ایذا بھی ملے گی،
کیوں جلوہ گہِ ہوش یہاں دل بھی کہیں ہے

مایوس سہی حسرتیٔ موت ہوں فانی
کس منہ سے کہوں دل میں تمنا بھی نہیں ہے

جلوہ ترا طلسمِ حجاباتِ نور ہے
جو جس قدر قریب ہے اتنا ہی دور ہے

تسلیم ہیں مجھے بھی تری بے نیازیاں،
یہ کیوں کہوں کہ میری تمنا غیور ہے

وہ ایک رنگینیٔ نظر ہے جو سو بہاروں میں دیکھتا ہوں
مری محبت کی خامیوں میں ادائے حسنِ تمام دیکھو

جو ہے وہ کیا ہے سوال یہ ہے کہ اب نگاہوں کا حال یہ ہے
جدھر نگاہیں ذرا اٹھاؤ ادھر تمہارا ہی نام دیکھو

یہ ترکِ بیداد قدرِ دل کیوں وفا تو اربابِ دل کی خو ہے
جفا سو تقدیرِ آرزو ہے ہٹاؤ بھی اپنا کام دیکھو

ہم ہیں اس کے خیال کی تصویر
جس کی تصویر ہے خیال اپنا

وہ بھی اب غم کو غم سمجھتے ہیں
دور پہونچا مگر ملال اپنا

دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے
یادِ جاناں قدم سنبھال اپنا

دلِ مایوس کو اے عہدِ کرم شاد نہ کر
نازِ پروردۂ غم ہے اسے برباد نہ کر

روحِ ارباب محبت کی لرز جاتی ہے
تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر

غمِ ہستی ہی سہی تیرے سوا کوئی ہو
دل کی بستی ہے تری غیر سے آباد نہ کر

صدا اور یہ صدائے دل اچھا تو خدا حافظ
قربان ہی اس بت پر ہوتا ہے تو جا ہو جا

ہر قافلۂ دل کو تو مژدۂ منزل دے
ہر ریگِ درِ غم میں نقشِ کفِ پا ہو جا

دم حریفِ زوالِ غم نہ ہوا
مرتے مرتے یہ درد کم نہ ہوا

بت نے ہر رنگ میں خدائی کی
دل مگر دیر سے حرم نہ ہوا

دم بھی فانی کسی کے دم تک ہے
دم نہ ہوگا اگر یہ غم نہ ہوا

دل تو سب کو تری سرکار سے مل جاتے ہیں
درد جب تک نہ ترے دل نہیں ہونے پاتے

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لئے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانی
ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

لب تک آجائے غمِ ہجر تو شکوہ ہو جائے
آپ سن لیں تو عجب کیا ہے کہ افسانہ بنے

یہ اشعار میں نے یونہی ادھر اُدھر سے چن لئے ہیں طوالت کے خوف سے زیادہ اشعار نقل نہیں کئے ہیں ان مثالوں کو سامنے رکھ کر مندرجۂ بالا خصوصیات کا آسانی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ جو مثالیں اوپر گزر چکی ہیں ان کے انتخاب میں میں نے اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا ہے کہ زیادہ تر آسان اور عام فہم اشعار ہی نقل کئے جائیں اور ان میں زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جن پر کسی نہ کسی طرح سے تغزل کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے اشعار بھی آگئے ہیں جو ان کے فلسفہ کے عکاس ہیں۔ ندرتِ خیال و بیان کی طرف تو اشارہ کرنا ہی بے سود ہے کیونکہ یہ اوصاف ازل ہی میں فانی کے لئے وقف کر دئے گئے تھے۔ جتنے اشعار اب تک نقل کئے جا چکے ہیں ناظرین اس سے خود ہی فیصلہ فرما سکتے ہیں ایک بات خصوصیت کے ساتھ یہاں پر عرض کر دینا چاہتا ہوں مجنوں گورکھپوری صاحب نے اقبال کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ:-

"اقبال کی شاعری کا بھی ایک غالب عنصر اس کی انفرادی موسیقیت ہے جس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہمواری

اور بلاغت ہے اس اعتبار سے اُردو کا کوئی دوسرا شاعر ان کا پورا حریف نظر نہیں آتا اگر داغ ہمواری میں ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو بلاغت اور معنوی قدر کا اُن کے یہاں پتہ نہیں ہے۔ اگر غالب بلاغت میں اقبال کے ہمسر، ہو سکتے ہیں تو ان کے کلام کی موسیقیت میں ایسی ہمواری نہ ملے گی۔" (اقبال از مجنوں ص ۸۸)

لیکن جہاں تک راقم فانی کا مطالعہ کر سکا ہے اور اسے سمجھ سکا ہے اس مطالعہ کی روشنی میں یہ کہنے پر مجبور ہے کہ فانی مندرجۂ بالا وصف میں اقبال کے پورے پورے حریف و مدمقابل ہیں، ان کا کلام اگر ترنم و روانی کے لحاظ سے اقبال کے کلام کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے تو بلاغت اور معنوی قدر کے لحاظ سے بھی اقبال کے کلام سے کسی طرح بھی کمتر نہیں ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اقبال کو جس حقیقت کی تلاش تھی اسے انھوں نے پا لیا۔ فانی بھی حقیقت کے متلاشی تھے مگر وہ عمر بھر باوجود تلاش مسلسل اسے نہ پا سکے۔ لیکن یہاں پر یہ مسئلہ زیر بحث نہیں ہے بلکہ آرٹ کی کسوٹی پر فانی کا کلام پرکھا جا رہا ہے اس کسوٹی پر اُنکا کلام اتنا ہی کھرا اُترتا ہے جتنا اقبال کا۔ خواہ وہ ترنم ہو یا بلاغت ہر پہلو سے فانی کا کلام اقبال کے کلام کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے۔ اور بات ہے کہ اقبال کے پرستار فانی کے اس وصف کا اعتراف نہ کریں مگر کسی نہ کسی روز کوئی نہ کوئی ناقد اس بے انصافی پر ضرور صدائے احتجاج بلند کرے گا۔ بہر حال جملوں کے اجزائے ترکیب کی مثالیں شاعرانہ حیثیت سے فانی کے عظیم فنکار ہونے کی دوسری دلیل ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ یہاں پر ضروری معلوم ہوتا ہے، ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ یہ اعتراض کریں کہ کسی شاعر کی عظمت کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ اس نے اپنی بات حسین الفاظ و انداز بیان میں کہدی ہو بلکہ اس کی عظمت کو پرکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس بات کا بھی جایزہ لیا جائے گا اس نے جو کچھ کہا ہے اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس کا کلام ہمارے دل میں جذبۂ انفعال پیدا کرتا ہے یا ہم کو پیام بیداری دیتا ہے؟ اگر صرف زبان کی خوبیوں سے کوئی شاعر عظیم ہو سکتا ہے تو ناسخ کی شاعری کو عظیم کیوں نہ کہا جائے؟ کسی شاعر کے کلام کو "کیا کہا" کی کسوٹی پر پرکھنے سے پہلے اسے عظیم شاعر کہدینا ایک ادبی خیانت ہوگی جو کسی بھی صورت میں قابل معافی نہیں ہے اس اعتراض کے بارے میں عرض یہ ہے کہ زیر نظر مقالہ میں فانی کی صرف شاعرانہ خصوصیات کا جایزہ لیا جا رہا ہے یعنی انھوں نے کن الفاظ اور کس اندازِ بیان سے اپنی بات کہی؟ کیا کہا اور جو کچھ کہا ہے اس کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس کا جواب (راقم کے نقطۂ نظر سے) اس مقالہ میں مل سکے گا جس کا حوالہ گزشتہ سطور میں دیا جا چکا ہے۔

سہلِ ممتنع سہلِ ممتنع کے لئے مختصر سے مختصر بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ سادگی کے معراجِ کمال کو سہلِ ممتنع کہتے ہیں۔ اس لئے آیئے سادگی کا تجزیہ کر ڈالیں۔ سادگی سے لوگ عموماً یہ مراد لیتے ہیں کہ جو بات کہی گئی ہو وہ بغیر کسی کاوش کے سمجھ میں آجائے اور شعر میں کوئی ایسا دقیق فلسفہ نہ بیان کیا گیا ہو جہاں تک پہونچنے سے ذہن انسانی قاصر رہے۔ یعنی خیالات اور اندازِ بیان دونوں کے لحاظ سے شعر عام فہم ہو۔ اگر اندازِ بیان سلیس و شستہ ہے مگر شعر میں کوئی پیچیدہ بات کہی گئی ہے تو اس شعر کو ہم سادگی کی مثال نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے سادگی کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ شعر میں کوئی نازک بات یا دقیق فلسفہ نہ بیان کیا جائے، نزاکتِ خیال کے باوجود بھی شعر سادہ ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جو آگے آئیں گی۔ سادگی کے اجزائے ترکیب مندرجۂ ذیل ہیں:-

۱- شعر کے اندر زبان اسی پابندی کے ساتھ استعمال کی جائے جس پابندی کے ساتھ نثر میں مستعمل ہوتی ہے۔ اگر بحر کی پابندی سے مجبور ہو کر الفاظ اِدھر اُدھر کئے جائیں تو بھی اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہئے کہ ان کی نشست میں غرابت نہ محسوس ہو۔ یہ غرابت جتنی بڑھتی جائے گی شعر اتنا ہی سادگی سے دور ہوتا جائے گا۔

۲- غزل کے ایک شعر میں اپنی پوری بات کہدینا بہت بڑا کمال ہے مگر اکثر شعراء بحر کی مجبوری سے اپنے مضمون کا کچھ حصہ حذف کر جاتے ہیں۔ یہ حذف شدہ حصہ ایسا ہونا چاہئے کہ سامع کا ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ سادگی کے منافی ہے۔ سادگی کا اطلاق شعر پر اسی وقت ہو سکتا ہے جب حذف شدہ حصہ مستعمل الفاظ کی روشنی میں سامع کے سامنے واضح طور سے آجائے۔

۳- تشبیہ، استعارہ اور تلمیحات اس طرح کی استعمال ہونی چاہئیں جو عام فہم اور "معلومِ عوام" ہوں۔ غالب کی اکثر تلمیحات اس مسلک سے ہٹی ہوئی ہیں اس لئے ان میں ہم کو غرابت کا احساس ہوتا ہے۔

۴۔ سادگی کے لئے روزمرہ کی پابندی ضروری ہے یہ تو ہو سکتا ہے کہ شاعر کوئی ایسی بلند بات کہے جو عام ذوق کی چیز نہ ہو مگر اس کو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ وہ جو بات کہے اسے اسی انداز سے کہ سب لوگ اپنے اپنے ظرف کے مطابق لطف اندوز ہو سکیں۔ یہ اور اسی قبیل کے چند دوسرے اجزا سادگی کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ اوصاف جیسے جیسے شعر سے دور ہوتے جائیں گے شعر ویسے ویسے پیچیدہ اور ناقابلِ فہم ہوتا جائے گا۔ اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اسے سمیٹ کر ایک جملے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ سادگی کے لئے ضروری ہے کہ الفاظ عام فہم استعمال کئے جائیں تشبیہات اور تلمیحات میں زیادہ دقت پسندی سے کام نہ لینا چاہئے۔ جملوں کے اجزائے ترکیب کا خیال رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ جو بات کہی جائے اس کے اندازِ بیان میں ایک ایسی جدت ہو کہ لوگ اسے ایک نئی بات سمجھنے پر مجبور ہوں اگرچہ وہ بات ولی و سراج کے زمانہ سے ہی کیوں نہ کہی جاتی ہو۔

فانی کے کلام سے سادگی کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ سب سے پہلے سہلِ ممتنع کی مثال لیجئے جو سادگی کے انتہائے کمال ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ غالب جیسا مشکل گو سہلِ ممتنع کا معترف رہا ہے اور اس نے شعوری طور پر بہت سی ایسی غزلیں لکھی ہیں جو اس وصف کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ فانی کے اشعار یہ ہیں۔ ۶

ضبط کا حوصلہ نکل جاتا — کچھ ستم اور بھی کئے ہوتے
زندگی بے دلوں پہ تہمت تھی — مر نہ جاتے اگر جئے ہوتے
کچھ سمجھ کر قفس میں لے صیاد — چار تنکے ہی رکھ دئے ہوتے
گل دئے تھے تو کاشِ فصلِ بہار — تو نے کانٹے بھی چن لئے ہوتے

دیر میں یا حرم میں گزرے گی — عمر تیرے ہی غم میں گزرے گی
کچھ امیدِ کرم میں گزری عمر — کچھ امیدِ کرم میں گزرے گی
زندگی یادِ دوست ہے یعنی — زندگی ہے تو غم میں گزرے گی
دل کو شوقِ نشاطِ وصل نہ چھیڑ — غم میں گزری ہے غم میں گزرے گی
ترکِ تدبیر کو بھی دیکھ لیا، — یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی
یوں ملی ہر نگاہ سے وہ نگاہ — ایک کی ایک کو خبر نہ ہوئی
اللہ اللہ یہ حسنِ پرسشِ حال — کہ مرے حال پر نظر نہ ہوئی
ہجر کے بھی ہزار پہلو تھے — یوں بھی اک وضعِ پر بسر نہ ہوئی
صبح ہوتی نہیں ہماری شام — ورنہ کس شام کی سحر نہ ہوئی

جل رہے ہیں آج تک دل کے چراغ — طور پر اک شمع جل کر رہ گئی
زندگی کی دوسری کروٹ تھی موت — زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی
چن لیا تیری محبت نے مجھے، — ساری دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی
کہتے ہو کہ ہم وعدۂ پرسش نہیں کرتے — یہ سن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا
آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت — احباب سے غم خوار ہوا بھی نہیں جاتا
جاتے ہوئے کھاتے ہو مری جان کی قسمیں — اب جان سے بیزار ہوا بھی نہیں جاتا
دیکھا نہ گیا اس سے تڑپتے ہوئے دل کو — ظالم سے جفا کار ہوا بھی نہیں جاتا
تم جسے در سے اٹھا دیتے تھے — آج دنیا سے وہ نام اٹھا
عشق کا ایک قصور اور سہی — موت کے سر سے تو الزام اٹھا

ابر اُٹھا سمتِ حرم سے زاہد — تو بھی سجادہ اُٹھا جام اُٹھا
ہل گئی پھر مرے دل کی دنیا — درد پھرے کے ترا نام اُٹھا
اشک ایک ایک کرکے سب آوارۂ دامن ہوئے — رفتہ رفتہ مٹ گیا نام و نشانِ اضطراب
وقتِ عرضِ حالِ دل اس فکر نے مارا مجھے — کیجئے آغاز کیونکر داستانِ اضطراب
اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز — میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز
صور و منصور و طور ارے توبہ — ایک ہے تیری بات کا انداز
دیکھئے کیا ہو عشق کا انجام — دل کی ہستی ہے موت کا آغاز
آج روزِ وصال فانی ہے — موت سے ہو رہے ہیں رازو نیاز
مہربانی کی آس رہنے دے — کون جیتا ہے مہربانی تک
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہونچی تری جوانی تک

میں نے کافی مثالیں درج کردی ہیں ان اشعار کو پڑھنے کے بعد ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ خیال ہو کہ اس طرح کے اشعار تو سبھی کہہ سکتے ہیں ان میں نہ تو مشکل الفاظ ہیں نہ ہی تشبیہات و استعارات بعید الفہم ہیں۔ تراکیب بھی پیچیدہ نہیں ہیں۔ روزمرہ اور محاورہ نے شاعر کو کاوشِ الفاظ سے بچا لیا ہے آخر ان اشعار میں وہ کونسا وصف ہے جس کی وجہ سے انھیں سراہا جا رہا ہے جو شعرا اس طرح کے خیالات رکھتے ہوں ان کے لئے مولانا شبلی کے ایک اقتباس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اقتباس درج ذیل ہے :-

"شاعری کی بڑی خوبی جدتِ ادا ہے۔ جدتِ ادا میں بات کو خواہ مخواہ کسی قدر معمولی پیرایہ سے بدل کر اور اصلی راستہ سے ہٹ کر بیان کرنا ہوتا ہے اس لئے شاعر کو اس موقع پر سخت مشکل کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں سادگی کو قایم رکھنا گویا اجتماع نقیضین ہوتا ہے لیکن حقیقت میں شاعری کے کمال کا یہی موقع ہے" (شعر العجم ج ۳ ص ۹۰)

مولانا مرحوم نے جس موقع کو شاعری کے کمال کا موقع کہا ہے اس موقع پر فانی کا کلام اتنا وسیع ہوجاتا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے مندرجۂ بالا امثال میں جدت کی کمی نہیں ہے لیکن آپ کو ان میں کوئی ایک بھی ایسی مثال نہ ملے گی جس میں جدتِ ادا کی وجہ سے سادگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہو یہاں پر مثال کے لئے صرف ایک شعر پر اکتفا کروں گا کیونکہ مثالیں کافی درج ہوچکی ہیں وہ شعر یہ ہے ؎

مہربانی کی آس رہنے دے — کون جیتا ہے مہربانی تک

ظنِ غالب یہ ہے کہ فانی نے غالب کے مندرجۂ ذیل شعر سے متاثر ہوکر یہ شعر کہا ہوگا :-

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن — خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غالب کا شعر صوری اور معنوی دونوں ہی لحاظ سے بلند ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ غالب کے بعد اس مضمون کو چھونے کی ہمت بھی کسی کو نہ کرنی چاہئے تھی مگر فانی نے اس مضمون کو اٹھایا اور کامیابی کے ساتھ نظم کیا۔ اس شعر میں جدت بھی ہے (جدت پر بحث آگے آئیگی) اور سادگی بھی یعنی جو کمال دکھانے کا موقع تھا وہاں فانی کمال دکھا گئے اسطرح کے کمالات آپ ان کے دیوان کے ہر صفحے پر دیکھ سکتے ہیں جہاں جدتِ ادا کے ساتھ ساتھ سادگی بھی جلوہ گر ہے اور اس انداز سے جلوہ گر ہے کہ سادگی ہی زیادہ نمایاں ہے یعنی سب سے پہلے ہماری نظر سادگی پر پڑتی ہے پھر جدتِ ادا پر۔ یہی وجہ ہے کہ فانی کے ان اشعار سے بھی جو معنوی لحاظ سے مشکل ہوتے ہیں یا جن میں ایہام ہوتا ہے اس سے عوام اور خواص دونوں ہی یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں یہ دوسری بات ہے کہ دونوں کا تاثر جدا جدا ہوتا ہے سادگی اور جدت کا یہی فنکارانہ امتزاج جس نے فانی کو ان کے معاصرین سے بالکل جدا کردیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ لوگ سوز و گداز کو اپنانے کے باوجود بھی فانی کے انداز کلام کو نہیں پا سکے ہیں۔ اکثر حضرات نے فانی کے انداز کو اپنانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے وجہ صاف ظاہر ہے ان حضرات کو فن اور اندازِ بیان پر وہ قابو نہ تھا جو فانی کو تھا اور یہی فانی کی شاعرانہ عظمت کی تیسری دلیل ہے۔

جوش اگرچہ ناقدین سلف نے مفہومِ جوش کی تعیین کردی ہے۔ مگر آج بھی اردو خوانوں کا ایک بڑا طبقہ اس کے غلط مفہوم پر بھی قناعت کرتا ہے۔ خصوصاً طلباء کو اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ ناقدینِ سلف کی کتابوں کا بغور مطالعہ کرسکیں اس لئے انھیں سنی سنائی باتوں پر اکتفا کرنی ہوتی ہے اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مفہومِ جوش پر بھی چند باتیں اجمالاً عرض کردی جائیں۔

لوگ عموماً جوش سے یہ مراد لیتے ہیں کہ الفاظ، زبان، اندازِ بیان، میں انتہا درجہ کی گرمی ہو۔ غیظ و غضب کے جذبات پھوٹے پڑتے ہوں۔ اور شاعر کے جذبات سیلِ رواں کے مانند مایل بہ تخریب ہوں۔ لیکن یہ عام خیال قطعاً غلط ہے۔ اس شعر میں بھی جوش ہو سکتا ہے جس کے الفاظ ملایم ہوں مضمون کے لحاظ سے حزنیہ ہو اور جذبات کے لحاظ سے پرحسرت۔ کیونکہ جوش کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی بات اس انداز سے کہی جائے کہ بے ساختہ پن سادگی اور تاثیر ہر ہر پہلو سے نمایاں ہو یہ وصف زیادہ تر انہی اشعار میں پیدا ہو سکتا ہے جن کو شاعر شدتِ جذبات سے مغلوب ہوکر اپنا دل ہلکا کرنے کے لئے کہتا ہے۔ خواہ ان اشعار کا تعلق کیفیات سے ہو خواہ واقعات سے مفہوم جوش کی اس تعیین کے بعد غیظ و غضب اور گرمی کی بندش کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا کیونکہ بہت سے حزنیہ اشعار ہم کو ایسے ملیں گے جن کو پڑھ کر ہم محسوس کریں گے کہ یہ بات شاعر کے دل سے نکلی ہے اس شعر کے ہر ہر لفظ میں تاثیر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی۔ یہ وصف ایک عرصہ کے ریاض کے بعد پیدا ہوتا ہے اور اس وصف کے بغیر شاعری ایک روکھی پھیکی سی چیز بن کر رہ جاتی ہے مولانا حالی نے میر تقی میر کا یہ شعر نقل کرکے لکھا ہے :-

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

"ایسے دھیمے الفاظ میں وہی لوگ جوش کو قایم رکھ سکتے ہیں جو میٹھی چھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں۔" (مقدمہ شعر و شاعری ص۔)

اس نقطۂ نظر سے جب ہم فانی کے کلام کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ اپنے دور کے ایک منفرد اور یگانۂ روزگار شاعر ثابت ہوتے ہیں۔ آیئے ان کی کاوشوں کا جایزہ لیا جائے۔

دورِ جدید جو کہ خوشگو شعراء سے خالی نہیں ہے اس دور میں فانی اپنی ایک مخصوص جگہ رکھتے ہیں اور مندرجہ بالا وصف میں ان کے برابر کے حریف یا مقابل صرف ڈاکٹر اقبال قرار دئے جاسکتے ہیں۔ ہر دو حضرات نے جوش کو اس کے معراجِ کمال تک پہونچایا ہے اس وصف میں ان دونوں حضرات سے حسرت، اصغر، جگر سب پیچھے رہ جاتے ہیں۔ البتہ ان کے بعد سب سے پہلا نام (میرے خیال میں) جگر کا آتا ہے۔ یہاں اقبال و فانی کا موازنہ مقصود نہیں ورنہ اقبال کے بھی اشعار نقل کرتا فانی کے کچھ اشعار مع مختصر تشریح کے ملاحظہ فرمائیں :-

یہی نہ ایک حقیقت سے بے نیاز ہے تو　　دلِ غیور کو اتنی سی بات نے مارا

اس شعر میں سادگی بھی ہے اصلیت اور جوش بھی (یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اصلیت کے بغیر جوش کا قایم رہنا مشکل ہے جوش کے لئے اصلیت کا ہونا لازمی ہے) لیکن جو بات کہی جارہی ہے وہ فخر و مباہات غیظ و غضب سے یکسر خالی ہے۔ پھر بھی اس شعر کو جوش کی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے قصداً اس خیال کو نظم نہیں کیا ہے بلکہ یہ مواد داغ میں پکتے پکتے پھوٹ پڑا ہے یعنی بے ساختہ ہے۔ اصلیت یوں ہے کہ ہر شخص جو محبت سے آشنا ہے اس راز کو جانتا ہے کہ "عشق است و ہزار بدگمانی" کسی کا بے نیاز ہونا کوئی انوکھا روزگار واقعہ نہیں ہے۔ مگر طالب جس کے لئے اپنی خوشیاں اپنا آرام سب کچھ تج دیتا ہے مطلوب کے اس فطری فعل پر بھی کڑھتا اور پریشان ہوتا ہے۔ بات تو کچھ بھی نہیں ہوتی مگر طالب اپنی محبت کی وجہ سے اُسے افسانہ بنا دیتا ہے یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ مگر اتنی بات سبھی لوگ مانیں گے کہ یہ شعر اصلیت پر مبنی ہے اور شاعر نے اسے شدتِ جذبات سے مغلوب ہوکر کہا ہے اس لئے جوش کی بہترین مثال ہے

◆

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا　　اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا

اس شعر میں بھی نفسیاتِ انسانی کی عکاسی کی گئی ہے مفہوم یہ ہے کہ طالب و مطلوب دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں نہ تو ان کو شباب کا ہوش تھا نہ ہی شاعر کو اپنے دل کا۔ اس کیفیت کو دوسرا مصرع واضح کردیتا ہے۔ "اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا"

اس مصرع کی معنویت اور نشتریت مجھے مجبور کر رہی ہے کہ میں اس مصرع کا تجزیہ نہ کروں بلکہ اپنی بات اشارۃً کہہ جاؤں - اسے میری خامی کہہ لیجئے یا کچھ اور مگر میں اس لطیف مصرع کو تجزیہ کر کے خاک میں نہیں ملانا چاہتا - دوسرے مصرع میں فانی نے اس کیفیت کو جو روبرو آنے کے بعد طالب و مطلوب کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے فنکارانہ انداز سے پیش کر دیا ہے - جس میں اصلیت ہے اور بے ساختہ پن بھی - دوسرے یہ کہ شعر سراسر آمد کا ہے اس لئے جوش کی بہترین مثال بن گیا ہے -

یہ محشر ہے یہاں جو چاک ہے رحمت بداماں ہے وہ دُنیا تھی جو ہنستی ہی رہی ہر چاک داماں پر

اس شعر کی بنیاد ایک عقیدہ پر رکھی گئی ہے "کہ خداوند تعالیٰ مظلوموں پر نظرِ کرم کرتا ہے" اس عقیدہ نے اصلیت کی جگہ لے لی ہے - شاعر کا یہ عقیدہ یقین کی حد تک پہونچا ہوا ہے جس نے شاعر سے یہ شعر کہلایا ہے شعر کا مفہوم تو صرف اس قدر ہے کہ "پریشاں حال محشر میں ہم آغوشِ رحمت ہیں" یہ سعادت ان کو صرف چاک گریباں کی وجہ سے نصیب ہوئی ہے - دنیا میں تو لوگ چاکِ گریباں پر ہنستے تھے مگر یہاں دوسرا ہی قاعدہ ہے، چونکہ شاعر نے اپنی تباہ حالی سے متاثر ہو کر روزِ محشر کی خیالی تصویر پیش کی ہے جس میں اس کا عقیدہ بھی شامل ہے، اس لئے شعر میں اصلیت بھی آگئی ہے اور جوش بھی -

سامانِ صد نگاہ ہے ہر ذرہ خاک کا لیکن یہ دیکھنا ہے کوئی دیکھتا بھی ہے

یہ شعر حقایق کا دفتر ہے اور اپنی اصلیت ہی کی وجہ سے پر جوش ہے، بظاہر تو اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اس کائنات کے ہر ذرہ میں ایک دوسری دنیا آباد ہے اگر دیکھنے والا ہو تو وہ ایک ذرہ میں بہت کچھ دیکھ سکتا ہے اور عبرت حاصل کر سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ لوگ عبرت حاصل کرتے بھی ہیں یا نہیں، یہ شعر اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ اگر دیدۂ بینا ہو تو اس کائنات کا ہر ذرہ ہمارے لئے درسِ عبرت بن سکتا ہے لیکن اس دُنیا کے اکثر انسان اس حقیقت سے صرفِ نظر کر کے آذوقۂ شام و سحر میں کھو جاتے ہیں - اس شعر میں سادگی، اصلیت اور جوش نے چار چاند لگا دئے ہیں -

غرض کہ فانی کے کلام سے اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں، ان کی کوئی بھی غزل لے لیجئے دو ایک شعر ضرور ایسے ملیں گے جو جوش و اثر سے لبریز ہوں گے - کچھ مثالیں بلا کسی تشریح کے پیش کر رہا ہوں ان پر ایک غائر نظر ڈال جائیے -

مجھ سے ہر جلوے نے سیکھا امتیازِ قلب و سنگ ورنہ حسنِ دوست کا آگے تو یہ عالم نہ تھا
ہر در سے ترے طالب ناکام پلٹ آئے کعبہ میں ہے سناٹا بت خانہ کو کیا کہئے
موج کیا گرداب کیسا کیوں کسی کا نام لوں خود سفینہ ہی مرا دعوت ہے طوفاں کے لئے
کمالِ ہوش ہے یوں بے نیازِ ہوش ہو جانا ترے آغوش میں بیگانۂ آغوش ہو جانا
بند ہے اب قفس کو سر تو پٹکے جائیے ہم نے دیکھا ہے قفس کی تیلیوں میں در کھلا
ادعائے ضبطِ غم بالکل بجا لیکن درست اور، جو دل کا حال چہرے سے نمایاں ہو گیا
لطفِ حیات بے خلشِ مدعا کہاں یعنی بقدرِ تلخیِ صہبا سرور تھا،
فانی اسی خلش سے عبارت ہے یادِ دوست جو انتہا کی زد میں نہ ہو ابتدا کے بعد
جا بجا تغیرِ حالِ دل کے چرچے ہوں تو ہوں ہم ہوئے رسوا مگر اب ہم کسے رسوا کریں،
زمانہ برسرِ آزار تھا مگر فانی، تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو
دلیلِ فتحِ عاشقی نویدِ صد شکست ہے امانت بہار ہے مری خزاں لئے ہوئے
جلوۂ رنگ ہے نیرنگِ تقاضائے نگاہ کوئی مجبورِ تماشائے سراب آتا ہے
خلشِ درد سے کم مایۂ غم ہیں محروم جنسِ حرماں کو خدا عزتِ ارزانی دے
ہر راہ سے گزر کر دل کی طرف چلا ہوں، کیا ہو جو ان کے گھر کی یہ راہ بھی نہ نکلے

زلطفِ دوست مرا نیمۂ نگاہ بس است | متاعِ خلد نہ جویم کہ رائگانِ من ست
خاکِ پائے بندگانِ درگہ عشقیم ما | ہر کجا صیدے بدام اوست صیادِ من ست
نازم چمنے را کہ نیازم بقفس نیست | ہر غنچہ کہ دل می کشدم حلقۂ دام است

صرف یہی اشعار نہیں بلکہ فانی کے سیکڑوں اشعار داخلی کیفیات کے ترجمان ہیں۔ ان کی ساری زندگی کاوش و جستجو اور سوچ بچار میں گزری۔ جیسے جیسے وہ سوچتے گئے، ان کا شعور ارتقا کی راہ پر گام بہ گام منزل کی طرف بڑھتا رہا ویسے ویسے وہ نئے نئے عالم میں پہونچتے رہے۔ جس کی تفصیل ہم ان کے کلام میں دیکھ سکتے ہیں۔ انسانی زندگی کے لمحہ بہ لمحہ بدلنے والے جذبات کی جس طرح فانی نے عکاسی کی ہے اب شاید ہی کوئی دوسرا شاعر ان کا کامیاب تتبع کر سکے۔ وجہ یہ ہے کہ فانی کا ایک ایک شعر مدتوں کے سوچے اور سمجھے جذبات پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے وہ ایک کیفیت کا تجزیہ کرتے ہیں اس پر سوچتے بچارتے ہیں اور جب یہی سوچ بچار ذہن میں پکتے پکتے اشعار کی شکل میں زیبِ قرطاس ہوتی ہے تو وہی سوچ بچار کیف و اثر اور جوش و خروش سے معمور ہوتی ہے — مولانا حالی کا ایک سطری اقتباس اوپر گزر چکا ہے انھوں نے لکھا ہے کہ ایسے دھیمے الفاظ میں وہی لوگ جوش کو قایم رکھ سکتے ہیں جو میٹھی چھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتے ہیں"۔ مولانا حالی مرحوم نے اس موقع مثال تیر کے شعر سے دی ہے۔ میرے نزدیک میر کے بعد اگر کوئی شاعر میٹھی چھری سے تیز خنجر کا کام لینا جانتا ہے تو وہ صرف فانی ہے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی بہتات ہے جن میں الفاظ نہایت نرم و سبک استعمال کئے گئے ہیں بحر کی وجہ سے ان میں ایک خاص ترنم آگیا ہے مگر جوشِ بیان کے لحاظ سے وہ "مادرائے شعر" ہو گئے ہیں۔ یہی وہ اشعار ہیں جو دوسروں کے دل میں شعور پیدا کرتے ہیں کیونکہ فانی خود باشعور ہیں یہاں اس سے بحث نہ ہونی چاہئے کہ وہ جو شعور پیدا کرتے ہیں اس کی قدر و قیمت کیا ہے مگر اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ وہ ہمارے دل میں بالغ نظری پیدا کر جاتے ہیں۔

فانی سے جو شعور ہمیں ورثہ میں ملتا ہے اسے اگر ان کے ایک شعر میں واضح کیا جائے تو یہ شعر پڑھنا ہوگا ؎

غم بھی گر شتق ہے خوشی بھی گر مشتنی | کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

فانی کی یہ تلاش یہ تگ و دو یہ بے قراری سنائی، عطار اور رومی کے جذبات سے قطعاً مختلف ہے۔ ہر حضرات پہلے اپنے قلب پر ایک جذبہ طاری کرتے ہیں یعنی ایک اکتساب کو حقیقت بناتے ہیں اور پھر اس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں مگر فانی کا کلام ان کی زندگی ان کی بے قراری ان کے سوز دروں کا ترجمان ہے وہ اتنا ہی کہتے ہیں جتنا محسوس کرتے ہیں انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے دل کی آواز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام سادگی، اصلیت اور جوش سے مزین ہے اور یہ ان کے عظیم فنکار ہونے کی چوتھی دلیل ہے۔

جدت یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے جس پر ناقدین سلف کا اجماع نہیں ہے بعض بعض حضرات نے تو جدت کے مفہوم کی تعیین میں وہ وہ گل کھلائے ہیں کہ کہنا ہی پڑتا ہے "ایں چہ بوالعجبی ست"۔ مولانا شبلی مرحوم نے بھی اپنی مشہور و معروف تصنیف "شعر العجم" میں جدت کے حدود صفات صاف نہیں بتلائے ہیں بلکہ انھوں نے اشعار اور ان کی تشریح سے یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ جدت کسے کہتے ہیں؟ اس موقع پر مولانا شبلی کا ایک مختصر اقتباس پیش کر دینا چاہتا ہوں:-

"جدت ادا کی منطقی تعریف اور اس کے اصول اور ان کے قوائد کا انضباط سخت مشکل بلکہ ناممکن ہے وہ ایک ذوقی چیز ہے۔ جس کا صحیح ادراک صرف ذوق صحیح ہی سے ہو سکتا ہے اس کا پیرایہ ہر جگہ الگ ہے اور اس قدر غیر محصور ہے کہ ان سب کا شمار ہو سکتا ہے نہ ان میں کوئی خاص قدر مشترک پیدا کیا جا سکتا ہے"۔ (شعر العجم - ج ۴ - ص ۹۹)

جب مولانا جیسی عظیم المرتبت ہستی نے مفہوم جدت کی تعیین نہیں کی تو میرے جیسے کم علم کے لئے بھی یہ زیب نہیں دیتا کہ خواہ مخواہ جدت کے مفہوم کو پیش کروں۔ ہاں صرف ایک بات یہاں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کچھ لوگوں کے نزدیک جدت ادا اور لطف ادا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ مگر راقم ان دونوں میں فرق کرتا ہے اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ بظاہر جدتِ ادا اور لطفِ ادا کی مثالیں اس طرح آپس میں مماثلت رکھتی ہیں کہ جلد فیصلہ

کرتا دشوار ہو جاتا ہے کہ اسے جدت کہا جائے یا لطفِ ادا۔ راقم کے نزدیک ان دونوں میں ایک باریک سا فرق ہے۔ لطفِ ادا کی مثال راقم اس شعر کو سمجھتا ہے جس شعر میں ایک سیدھی سادی بات اس طرح پیش کر دی گئی ہو جس میں زبان کی چاشنی کے ساتھ ظاہری معنی بدلے ہوئے ہوں مثلاً "شعر العجم" ہی سے مثال لیجئے:۔

زخمہا بر داشتیم و فتح ہا کردیم لیک ہرگز از خونِ کسے رنگیں نشد دامان ما

اس شعر کا ترجمہ تو یہ ہے:۔ "ہم نے بہت سے زخم کھائے فتحیں کیں لیکن ہمارا دامن کسی کے خون سے آلودہ نہ ہوا" لیکن شاعر کا اصل مفہوم یہ ہے:۔ "ہم سے حریفانِ فن سے مقابلہ رہا انھوں نے ہماری ہر طرح سے برائی کی لیکن ہم نے صبر کیا اس طرح ہمارے علم کا سکہ ان پر بیٹھ گیا" یہ تو رہی لطفِ ادا کی مثال۔ جدت اس سے کچھ الگ ہی چیز ہے۔ جدت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک بات جو کہ شاعر سے پہلے بھی لوگ کہتے آئے ہیں اسے شاعر اس انداز سے کہدے کہ ایک نئی بات معلوم ہو مطلب یہ ہے کہ مفہوم وہی رہے الفاظ بھی زیادہ نہ بدلے ہوئے ہوں مگر بات اس انداز سے کہی جائے کہ سامعین کو یہ احساس نہ ہو سکے کہ یہ بات ہم نے اس سے پہلے بھی سنی ہے مثلاً غالب کا ایک شعر ہے:۔

کیوں بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

اسی مفہوم کو اس دور کا شاعر یوں نظم کرتا ہے:۔

کیوں مرے ذوقِ تصور پر تمھیں شک ہو گیا تم ہی تم ہوتے ہو کوئی دوسرا ہوتا نہیں

مفہوم وہی ہے مگر جدت نے شعر کو نیا بنا دیا ہے کہ اور کچھ معلوم ہوتا ہے اس شعر پر سرقہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا اگر آپ سرقہ پر تفصیلی بحث چاہتے ہیں تو سہیل مرحوم کا وہ مضمون جو "گنجینۂ تحقیق" پر عرصہ ہوا "معارف" میں شایع ہو چکا ہے دیکھ لیں۔ یہاں اس بات کا محل نہیں ہے کہ اس بحث کی تکرار کر دوں، بے حال میرے نزدیک لطفِ ادا اور جدت میں فرق ہے جیسا کہ میں نے مثال سے ظاہر کر دیا ہے اگر میں نے اس تجزیہ میں کہیں پر غلطی کی ہو تو سخن شناس حضرات مجھے ہر وقت ٹوک سکتے ہیں میں ہر وقت اپنی رائے بدلنے کو تیار ہوں۔ اب میں لطفِ ادا سے قطع نظر کرتا ہوں اور کلامِ فانی اپنے جدت کے نمونے ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس بحث کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فانی کے کسی قادر الکلام معاصر کا انتخاب کر لیا جائے جس کی قادر الکلامی ناقدین کی نگاہوں میں مسلم ہو اور دونوں حضرات کے ہم معنی اشعار پیش کر دئے جائیں اور یہ ظاہر کر دیا جائے کہ فانی نے اپنے معاصر کے مقابلہ میں کس جدت کے ساتھ اسی مضمون کو نظم کیا ہے۔ میرے خیال میں فانی کے معاصرین میں مولانا سہیل مرحوم کا انتخاب سب سے بہتر ہوگا۔ کیونکہ مرحوم کی قادر الکلامی سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ لوگ ان کے نظریات سے متفق نہ ہوں مگر انھیں قادر الکلام شاعر ماننے میں کسی کو بھی تامل نہ ہوگا۔ ذیل میں کچھ مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

مولانا سہیل مرحوم کا ایک بہت مشہور شعر ہے:۔

وہ رویں جو منکر ہوں حیاتِ شہدا کے ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

اس شعر میں موجودہ عزاداری پر تنقید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ جو لوگ حضرت امام حسینؑ کی حیات کے منکر ہوں گے صرف وہی ماتم روا رکھ سکتے ہیں۔ ہم ان کو زندۂ جاوید سمجھتے ہیں (شہید ہونے کی بنا پر) اس لئے ہمارے مشرب میں ان کا ماتم کفر ہے۔"

اسی مضمون کو فانی کو بانی سنئے:

موت جس کی حیات ہو فانی اس شہیدِ ستم کا ماتم کیا

سہیل کا شعر حدودِ تغزل سے باہر ہے، دوسری بات یہ کہ ماتمِ حسینؑ ہمارے یہاں ایک فرقہ کا مذہبی عقیدہ ہے اس کی رد سے یہ شعر ایک قسم کی بدمزگی پیدا کرتا ہے۔ فانی نے "برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست" کہتے ہوئے اسی خیال کو ایک لطیف انداز سے نظم کر دیا ہے اب شایع فانی کے شعر کو حضرت امام حسینؑ کی طرف منسوب کرے یا کسی عاشقِ ناکام کی طرف دونوں ہی شرحیں قابلِ قبول ہوں گی۔ تیسری چیز یہ کہ جن حضرات کو سہیل صاحب کا شعر معلوم ہے وہ فانی کا شعر پڑھ کر جلو یہ بھی نہیں سمجھ پاتے کہ اسی مضمون کا شعر کہیں اور بھی نظم ہو چکا ہے۔ فانی کا شعر

اپنی جگہ اور بحل معلوم ہوتا ہے یہی ان کی جدت ہے اور یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔

سہیل کا شعر ہے :-

اسیروں میں بھی ہو جائیں جو کچھ آشفتہ سر پیدا ابھی دیوارِ زنداں میں ہوا جاتا ہے در پیدا

سہیل کا یہ شعر ان کے اچھے اشعار میں سے ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جوش سے لبریز ہے اس شعر میں کہا گیا ہے کہ "اگر عزم و ہمت سے کام لیا جائے تو دیوارِ زنداں بھی ٹوٹ سکتی ہے اب دیکھئے فانی نے اسی مضمون کو کس انوکھے پن اور کس بے ساختگی سے ادا کیا ہے :-

بند ہے بابِ قفس گو سر تو پٹکے جایئے ہم نے دیکھا ہے قفس کی تیلیوں میں در کھلا

فانی کے شعر میں فلسفۂ اسمی ہے اور بالکل وہی مضمون نظم کیا گیا ہے جو سہیل کے شعر کا ہے مگر اندازِ بیان اس طرح بدل گیا ہے کہ دونوں شعر دو مضمون کے معلوم ہوتے ہیں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے کہ جو اثر فانی کے اشعار میں ہوتا ہے وہ اثر سہیل کے اشعار میں نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سہیل ایک قادر الکلام تھے وہ ہر مضمون کو بلا تکلف نظم کر دیتے ہیں اور اکثر ان کے اشعار دماغ کے امتزاج سے پیدا ہوتے ہیں۔ چونکہ دماغی کاوش میں دلی سوز شامل ہوتا ہے اس لئے وہ پُر اثر ہوتے ہیں۔ یہ سہیل کے مقابلہ میں فانی کی کامیابی کی دلیل ہے۔

سہیل کا شعر ہے :-

آپ اگر ہیں کہیں تو دیں آواز کیوں پھراتے ہیں کو بکو مجھکو

اس شعر میں سہیل کا خاص رنگ نہیں ہے مگر پھر بھی شعر لطیف ہے۔ اسی مضمون کو فانی نے یوں نظم کیا ہے :-

جلوۂ یار کا بھکاری ہوں شش جہت کاسۂ گدائی ہے

فانی نے اسی مضمون کو اس لطیف انداز سے نظم کر دیا ہے کہ دونوں کی مماثلت میں شک ہوتا ہے اور جب تک سوچ سمجھ کر تجزیہ نہ کیا جائے یہ شک قایم رہتا ہے۔ فانی کا شعر سہیل کے شعر سے گئی گنا لطیف ہے جس کی تشریح کی چنداں ضرورت نہیں، اربابِ ذوق پر یہ فرق خود ظاہر ہوگا۔

سہیل کا شعر ہے ؏

شاید حیات اسی کو کہتے ہیں کہنے والے ہوتی ہے اک چبھن سی رگ رگ میں آرزو کی

فانی کا شعر دیکھئے :- ؏

اسی کو تم مگر اے اہلِ دُنیا جان کہتے ہو وہ کانٹا جو مری رگ رگ میں رہ رہ کے کھٹکتا ہے

فانی کی بحر سہیل کی بحر سے زیادہ رواں ہے اس لئے فانی کے شعر میں اور بھی تاثیر آگئی ہے۔ اس کے علاوہ "آرزو کی رگ رگ میں چبھن" سے سامع کا دماغ اتنی آسانی سے نہیں پہونچتا جتنی آسانی سے "وہ کانٹا.... الخ" کہنے سے مفہوم تک بہ آسانی پہونچ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فانی کے شعر میں سہیل کے شعر دل کی پکار ہے اور سہیل کا شعر دماغی فلسفۂ حیات کا ترجمان۔

سہیل کہتے ہیں ؏

امتحاں آج ہے خورشید قیامت تیرا لے مقابل ترے ہم دامنِ تر کرتے ہیں

فانی کا رجز ملاحظہ ہو ؏

منھ ڈھانپ لیا جوشِ ندامت کے اثر سے خورشیدِ قیامت نے مرے دامنِ تر سے

دونوں اشعار کا فرق اظہر من الشمس ہے مگر پھر بھی اتنی بات ضرور عرض کروں گا جوشِ ندامت کے اثر سے منھ ڈھانپ لینے کے ٹکڑے نے فانی کے شعر میں جو لطف پیدا کر دیا ہے وہ امتحاں آج ہے کے ٹکڑے میں نہیں ہے۔

سہیل کا شعر ہے ؏

رکوں تو موجِ غم کو دلِ بے قرار میں ساغر چھلک نہ جائے کفِ رعشہ دار میں

شعر بڑا اچھا ہے اور دوسرے مصرع نے اس میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ مگر فانی کا کمال ملاحظہ ہو ع

ادعائے ضبطِ غم بالکل بجا یکسر درست اور جو دل کا حال چہرے سے نمایاں ہو گیا

فانی کے شعر کا مضمون ایک بالکل ہی نیا مضمون معلوم ہوتا ہے۔ کفِ عشقہ دار میں ساغر کا چھلک جانا کوئی تعجب خیز واقعہ نہیں ہے۔ مگر باوجود ضبطِ غم دل کا حال چہرے سے نمایاں ہو جانا ایک ایسا سانحہ ہے جس سے طالبِ ناکام کی داستانِ عشق کے اوراق الٹ جاتے ہیں۔ بہرحال ایک مجبوری کی عکاسی دونوں شعر میں ہے مگر فانی کے اچھوتے اندازِ بیان نے ان کے شعر کو کافی آگے بڑھا دیا ہے۔ غرض کہ کہاں تک تشریح کی جائے اس طرح بہت سی مثالیں ہیں۔ میں ہر دو حضرات کے اشعار پہلو بہ پہلو نقل کر دیتا ہوں ناظرین خود فیصلہ فرمالیں ؎

سہیل

سنائیں کس کو الٰہی غمِ نہاں اپنا
اس انجمن میں نہیں کوئی ہم زباں اپنا
سہیلِ خستہ نقادانِ معنی اٹھتے جاتے ہیں
ترا نغمہ بہار لالۂ صحرا نہ ہو جائے
چھایا ہوا ہے دیدہ و دل پر جمالِ حق
باطل بھی اب نگاہ میں باطل نہیں رہا
چشمِ کرم کی شوخیِ طرزِ ستم نہ پوچھ
غم بھی بقدرِ حوصلۂ دل نہیں رہا
شعاعِ برقِ ایمن ہے یہاں ہر خس نشیمن کا
جلا دے جس کو بجلی وہ ہمارا آشیاں کیوں ہو
اک مشقِ اضطراب کا رکھا ہے نام زیست
اف بے کسی کہ وہ بھی نہیں اختیار میں
وہ مستِ نازِ حسن میں سرشار آرزو
وہ اختیار میں ہیں نہ میں اختیار میں
مرے وجود کا پردہ ہے خود مری ہستی
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا تو راز داں ہوتا
بیزارِ زندگی کو ہے عمرِ ابد عذاب
ڈرتا ہوں دستِ ناز میں تلوار دیکھ کر
دل میں رہے تو پھر نظر آیا کرے کوئی
خود اپنے گھر میں کس لئے پردا کرے کوئی
اٹھی تھی بحرِ حسن سے اک موجِ بے قرار
فطرت نے اس کو پیکرِ انساں بنا دیا
غم ہے اساسِ فطرتِ دنیا ہے رنگ و بو کی
شبنم کے فیض سے ہیں تر دستیاں نمو کی

فانی

ہاں دل میں درد بھی ہے زباں بھی نہیں ہے بند
کس سے کہیں کوئی دلِ درد آشنا بھی ہے ؟
اٹھ گئے دنیا سے فانی اہلِ ذوق،
ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے
اک حق کے سوا کوئی ہستی ہی نہیں ہے رب
یوں میرے سر آنکھوں پر تمیزِ حق و باطل
یہ طرفہ ستم ہے کہ ستم بھی ہے کرم بھی
اب خوگرِ آزار ہوا بھی نہیں جاتا
آخر یہ کہ پروردۂ فنا ہوں میں
بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیاد
تو نے کرم کیا تو بعنوانِ رنجِ زیست
غم بھی دیا مجھے تو غمِ جاوداں نہ تھا
ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا
مرا وجود ہے میری نگاہِ خود نشناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا
ہو غمِ ہستیِ جاوید گوارا کیونکر
جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم
وہ جلوہ بے حجاب سہی فہم کا کیا علاج
جب دل میں آ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی
غم کو بنا کے محرمِ اسرارِ کائنات
ہر نقشِ غم کو پیکرِ انساں بنا دیا
رفتِ سیمِ خزاں تھی اس جہاں کی ہر بہار
خندۂ گل تھا مگر بے گریۂ شبنم نہ تھا

جھکتے ہی اس نظر کے یہاں چپ سی لگ گئی
تھے سب گلے بس اک نگہِ شرمسار تک

دل ان کے نہ آنے تک لبریزِ شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

میرے خیال میں مثالیں کافی درج کی جاچکیں ناظرین اتنی ہی مثالوں سے فانی کی جدت کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ان اشعار کو نقل کرنے سے فانی اور سہیل کا موازنہ مقصود نہیں، نہ ہی اس سے ہر دو حضرات میں سے کسی کے بھی کمال پر کوئی حرف آتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو سہیل و فانی کا تذکرہ ناگوار ہو۔ تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ سہیل مرحوم کا راقم سے ایک روحانی تعلق ہے وہ یہ کہ مرحوم میرے استاذ کے استاذ ہیں اس لئے وہ میرے لئے معترضین سے زیادہ لائقِ احترام ہیں۔ خدا کے فضل سے میں اتنا باہوش ہوں کہ فرق مراتب میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرسکتا یہ روش جو میں نے اختیار کی ہے وہی روش ہے جس پر مرحوم کا سمندِ تنقید گامزن تھا۔ اس اتباع پر میں ناز کرتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں نے شخصیت کو پس پشت ڈالکر حقایق پیش کردئے ہیں۔ اگر اب بھی کچھ لوگ مجھے گردن زدنی ہی سمجھیں تو مجبوری ہے۔ میں نے ہم معنی اشعار صرف اس لئے پہلو بہ پہلو درج کردئے ہیں تاکہ دونوں حضرات کا منفرد اندازِ بیان واضح ہوجائے۔ خود سہیل نے فانی کو اپنا ہم زبان کہا ہے ؎

ہوئے آزادِ قیدِ آب و گِل اصغر بھی فانی بھی
سہیل اب کون باقی ہے چمن میں ہم زباں میرا

اب اگر ہم زبانوں کے اشعار پہلو بہ پہلو نہ رکھے جائیں تو کس طرح ان کے منفرد اندازِ بیان کو واضح کیا جاسکتا ہے؟ فانی کے کلام کا زیادہ تر حصہ اسی جدت سے عبارت ہے وہ مضامین جن کو قدما نے بھی نظم کیا ہے فانی نے اگر ان مضامین کو ہاتھ لگایا ہے تو وہ ایک دوسرے ہی روپ میں ہمارے سامنے آئے ہیں اور ان میں اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ یہی جدت فانی کی فنکارانہ عظمت کی پانچویں دلیل ہے۔

لطفِ زبان

اس عنوان سے مجھے کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے کیونکہ اس عنوان کے حدود کی تعیین سخت دشوار یا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ سراسر ذوق کا مسئلہ ہے اور صرف ذوقِ صحیح ہی اس سے لطف اندوز ہوسکتا ہے تاہم میں اس چیز کی کوشش کروں گا کہ لطفِ زبان کی ایک دھندلی سی تصویر ناظرین کے سامنے پیش کرجاؤں یوں تو ہر پڑھا لکھا شاعر کہ قواعد کے رو سے اس میں کوئی خامی نہ آنے پائے لیکن زبان کا یہ استعمال لطفِ زبان کا ضامن نہیں ہے۔ کچھ اشعار آپ کی نظروں سے ایسے گزرتے ہوں گے جن کا اسلوبِ بیان عام اشعار کی طرح ہوتا ہے معنی کے لحاظ سے بھی ویسے اشعار دوسرے شاعر کہنے پر قادر ہوتے ہیں زبان بھی نہایت آسان ہوتی ہے مگر اس شعر میں کوئی ایک لفظ ایسی جگہ پر رکھ دیا جاتا ہے جو شعر کی معنویت کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتا ہے اگر اس لفظ کو ہٹاکر اس کے مرادف کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو شعر کا سارا لطف خاک ہوجاتا ہے اور شعر اتنا موثر نہیں رہ جاتا جتنا پہلے تھا۔ مثال کے طور پر فراق گورکھپوری کا ایک شعر لیجئے ؎

ہم سے کیا ہوسکا محبت میں
خیر تونے تو بے وفائی کی

اس شعر میں کوئی ایسی خاص بات نہیں کہی گئی ہے جس کے کہنے سے فراق کے معاصر قاصر ہوں مگر فراق نے اس شعر میں زبان کو جس طرح استعمال کیا ہے البتہ قابلِ تعریف ہے۔ صرف ایک لفظ "خیر" کو اس شعر سے نکال دیجئے اور اس کی جگہ پر کوئی فصیح سے فصیح لفظ رکھ دیجئے وہ زورِ بیان وہ ندرت آہی نہیں سکتی جو اس لفظ "خیر" کی وجہ سے شعر میں آگئی ہے۔ اسی طرح الفاظ کو فنکارانہ انداز سے نظم کرنا "لطفِ زبان" کے عنوان میں شامل ہے۔ ایک دوسرا شعر لیجئے۔ ساحر لدھیانوی کہتے ہیں ؎

ہم کریں ترکِ وفا اچھا چلو یونہی سہی
اور اگر ترکِ وفا سے بھی نہ رسوائی گئی

اس شعر میں کسی خاص ایک لفظ پر زور نہیں دیا گیا ہے بلکہ کچھ ٹکڑوں کی وجہ سے یہ شعر لطفِ زبان کی حدود میں آتا ہے "اچھا چلو یونہی سہی" اور "اگر" یہ ٹکڑے لطفِ زبان کی بہترین مثال ہیں۔ اگر یہی شعر ساحر نے کسی دوسرے انداز سے کہا ہوتا تو یہ نشتریت شعر میں کبھی نہ آسکتی تھی ۔ دوسری مثال لیجئے حفیظ میرٹھی کہتے ہیں ؎

کیا جانے کیا سبب ہے کہ جو چاہتا ہے آج
روئے ہی جائیں سامنے تم کو بٹھا کے ہم

اس شعر میں "کیا جانے کیا سبب ہے" کے بجائے "نہیں معلوم" اسی قسم کا کوئی لفظ جو بحر میں آسکتا ہو رکھ دیا جائے اور "ہی" کو نکال کر

کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے۔ تو یہی شعر کوڑی کے مول کا ہوگا۔ خیر یہ تو وہ اشعار تھے جن کا تعلق دل کی دُنیا سے تھا۔ وہ اشعار جن میں شاعر اپنے نظریۂ حیات کی عکاسی کرتا ہے اس شعر میں بھی لطفِ زبان کا خیال رکھنا ناگزیر ہے کیونکہ بڑی سے بڑی اور اچھی سے اچھی بات اگر بھونڈے طریقے سے کہی جائے گی تو کبھی بھی موثر نہیں ہوسکتی مثلاً حفیظ میرٹھی کا شعر لیجئے۔ اس شعر میں موجودہ قیادت پر سخت تنقید ہے ؎

بھلی رہ نمائیاں ہیں بھلی ناخدائیاں ہیں — وہی رخ قرار پایا جو بتا دیا ہوا نے

اس شعر سے اگر ایک لفظ "بھلی" نکال دیجئے تو شعر کا سارا کا سارا اثر ختم ہوجائے گا یہ تو ہوسکتا ہے کہ یہ شعر پروپگنڈہ کی اچھی مثال بنجائے مگر اچھا شعر نہیں رہ سکتا۔ حفیظ میرٹھی کا دوسرا شعر لے لیجئے ؎

یہ بھی اچھا ہوا تجھ پر نہ کھلا رازِ حیات — سانس کہتے ہیں جسے نشترِ جاں ہوجاتا

اس شعر سے ایک ٹکڑا "یہ بھی اچھا ہوا" نکال دینے کے بعد شعر میں کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ حالانکہ مفہوم کے لحاظ سے شعر اس وقت بھی قابلِ قدر رہے گا۔ مان لیجئے یہ بھی اچھا ہوا کہ جگہ یوں کہدیا جائے "شکر ادا کرے کہ" اس ٹکڑہ میں کوئی لفظ غیر فصیح نہیں ہے مگر پورے شعر کے فضا کی مناسبت سے یہ "بھی اچھا ہوا" کا استعمال ناگزیر ہے۔

ان مثالوں سے کچھ کچھ واضح ہوگیا ہوگا کہ لطفِ زبان سے میں کیا مراد لے رہا ہوں۔ فانی کی شاعری ایک تو یونہی زبان و اندازِ بیان کی مکمل مرقع نگاری ہے اور ان کے یہاں صنعتوں کا ایک ایسا فنکارانہ استعمال ملتا ہے جس سے ان کے معاصرین کا کلام خالی ہے۔ ان قیود کے باوجود انکے اشعار صرف زبان اور صنعتوں کے شہ کار ہوکر نہیں رہ جاتے بلکہ وہ ہمارے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ فانی کو زبان پر اتنا زیادہ قابو تھا کہ وہ نازک سے نازک اور بلیغ سے بلیغ بات اس انداز سے کہتے ہیں کہ بات کی نزاکت بھی نہیں مجروح ہوتی اور نہ ہی زبان لکھڑنے پاتی ہے مجھے تو فانی کی ذہنی اپج پر بعض اوقات سخت تعجب ہوتا ہے کہ اس شاعر کا ذہن شعر کے لئے کتنا موزوں سانچہ ہے کہ جو خیال اس سانچہ میں پہونچ گیا۔ اس طرح ڈھل ڈھلا کر نکلا کہ فخر و غرور سے یہ اعلان کرنے پر مجبور ہوگیا۔ "یا صورتے کش ایں چنیں یا ترک کن صورت گری"

اگر فانی زندگی کی محرومیوں اور رعنائیوں میں نہ ڈوبتے کسی کی تلاش میں نہ گم ہوتے کائنات کے اسرار کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش نہ بھی کرتے تو بھی ان کا شمار اُردو غزل گو شعرا کی صفِ اول میں ہوتا۔ کیونکہ فنکارانہ اندازِ بیان نے ان کی شاعری میں کچھ ایسی قدروں کا اضافہ کردیا ہے جن کی موجودگی میں ان کے کلام کی تاثیر سے انکار ناممکن ہوجاتا ہے۔ تو ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو ان کے نظریۂ حیات سے اختلاف ہو ان کے سوچنے کے طرز کو لوگ خود فریبی سے تعبیر کریں مگر یہ ناممکن ہے کہ لوگ ان کی شاعری کو "فنِ شاعری" کی بہترین مثال ماننے سے انکار کریں اگر کوئی ناقد اس پہلو سے بھی ان کی شاعری کا منکر ہو تو بلا جھجھک کہا جاسکتا ہے کہ وہ فنِ شاعری سے قطعاً نابلد ہے۔ بہرحال اب کچھ مثالیں پیش کر رہا ہوں ملاحظہ ہوں :-

سن تو لیا ہے حالِ دل دیکھئے سن کے کیا کہیں — پھر مرے منہ کی بات ہے کیسی ہی دلنشیں سہی
میں ہوں رہینِ انتظار آیئے یا نہ آیئے، — اپنے یقیں کو کیا کروں آپ کی ہاں نہیں سہی
فانیِ زار پر کرم تیری رضا کے ہے سپرد — ایک نگاہ اور اگر وہ بھی نہیں، نہیں سہی

آپ نے انجام دیکھا عشق کا — آپ نے فانی کی تربت دیکھ لی
کم دردِ جگر ہے یا بہت ہے — جو آپ سے مل گیا بہت ہے
ان کے آگے غم اک فسانہ ہے — ان سے کہئے فسانۂ غم کیا
بلاکشوں کا تمہاری بلا کرے ماتم — جو غم اٹھانے کو آئے تھے غم اٹھا کے چلے
اثر پابندِ بے تابی نہیں تو ضبط ہی کیوں ہو — بلا سے حالِ دل کچھ بھی سہی ناگفتنی کیوں ہو
خدا دے یہ خدائے دل اچھا تو خیر اور اگر — قربان ہو اس بت پہ ہوتا ہے تو جا ہو جا

محبت کی خلش کا دیکھئے انجام کیا ٹھہرے — تکلف برطرف ہر سانس نشتر ہوتی جاتی ہے

ہے یاد تری رونقِ خلوتگہِ خاطر — ہے ذکر ترا شمعِ شبستانِ تمنا

تم شامِ شبِ فرقت بے ساختہ آنکلے — یا کفر کے پردے سے ایمان نکل آیا

کہتے ہیں یہاں حضرتِ فانی تو نہیں ہیں — اس انجمنِ ناز میں کیا ہم بھی کہیں ہیں

مطلب ہے ضبطِ عشق سے تاثیرِ دردِ عشق — اخفائے حال سے غرض افشائے حال ہے

ہستی تھی گو خواب پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی — چونک اٹھتے تھے ہم گھبرا کر آنکھ نہ پھر بھی کھلتی تھی

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آگے جگا تو جاتے ہیں — ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

یہ اور اسی قسم کے بہت سے اشعار فانی کے عظیم فنکار ہونے کی دلیلیں ہیں۔ ان اشعار میں بعض بعض جگہ حیات و کائنات پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ دل کی دنیا سے نکل کر حادثات اور واقعات کی دنیا کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے اور اس مشاہدہ کا تاثر بھی پیش کیا گیا ہے۔ مگر زبان کا استعمال ویسا ہی فنکارانہ ہے جیسا حدیثِ دل کی ترجمانی کا۔ جوش صاحب نے اقبال کے لئے لکھا ہے کہ "اقبال ان لوگوں میں نہیں سوچ سوچ کر رہ جائیں یا سمجھ سمجھ کر بچائیں"، ٹھیک یہی بات انہی الفاظ کے ساتھ فانی کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔ جس مقالہ میں میں ان کے نظریۂ زندگی سے بحث کروں گا اس حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر اتنی بات یہاں سمجھ لینی چاہئے کہ یہ ایسی تلاش مفصل و سفر پیہم زبان و اندازِ بیان کا ایک ایک گوشہ مکمل رکھنے والا شاعر عظیم فنکار ہوتا ہے ورنہ شاعری میں فلسفہ اگلنے والوں کی تو نہ کسی زمانہ میں کمی رہی ہے نہ رہے گی مگر ہم اس شاعر کو عظیم فنکار کہہ سکتے ہیں جس نے زبان و اندازِ بیان کے لحاظ سے عظیم شاعری پیش کی ہو۔ اور جس کی شاعری صرف زبان کی اسیر نہ ہو جس کے اشعار شراروں کی لپک اور موجِ نسیمِ صبح کی خنکی سے مالا مال ہوں اور جس کے اشعار میں سیلِ رواں کی سی تندی و تیزی ہو۔

مندرجۂ بالا اصول پر بھی فانی کا کلام کھرا ہی ثابت ہوتا ہے۔ یہ ان کے عظیم فنکار ہونے کی پختی دلیل ہے۔

تغزل

یہ لفظ بھی جتنا مستعمل ہے اتنا ہی اس کا مفہوم غیر متعین ہے۔ اس لئے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اپنی بات کہنے سے پہلے دوسرے حضرات کے چند اقوال پیش کر دئے جائیں جس میں انھوں نے تغزل کے مفہوم پر روشنی ڈالی ہو۔ بعد ازاں اپنا بھی خیال پیش کروں کہ میرے نزدیک تغزل کیا ہے؟ اور پھر یہ بتلانے کی کوشش کروں کہ میں اس تعریف کو کیوں صحیح سمجھتا ہوں۔

میں نے تغزل کے مفہوم کی طرف چند بزرگوں کی توجہ مبذول کرائی مگر مجھے خاطر خواہ جواب کہیں سے نہ مل سکا۔ صرف ایک بزرگ[1] نے کرم فرمایا اور صرف دو سطروں میں میری مشکل حل کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ "تغزل کے لغوی معنی ہیں محبوب کی باتیں کرنا..." مجھے اس تعریف سے بھی کچھ اطمینان نہیں ہوا۔ اس موقع پر مجھے اپنے دینی بھائی وحید الدین خاں صاحب کی ایک گفتگو یاد آ رہی ہے جو اسی مسئلہ پر ہوئی تھی۔ الفاظ تو ذہن میں محفوظ نہیں رہ گئے مگر مفہوم محفوظ ہے۔ اسے یہاں نقل کر رہا ہوں۔ اس موقع پر یہ بات اور بھی جان لینی چاہئے کہ میں ایک عرصہ کے سوچ بچار کے بعد اسی نظریہ تک پہونچا ہوں جس کی طرف برادرم محترم نے اشارہ کیا ہے۔ ان کا مفہوم اپنے الفاظ میں پیش کر رہا ہوں کیونکہ وحید بھائی کے الفاظ بالکل ہی ذہن میں نہیں ہیں۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ حدیثِ حسن و عشق پر بھی تغزل کا اطلاق ہوتا ہے اور عموماً یہی سمجھا جاتا ہے کہ حسن و عشق کی داستان کا نام تغزل ہے۔ مگر میرے خیال میں تغزل کی یہ صحیح تعریف نہیں ہے۔ اصل میں تغزل ان تمام کیفیات کی ترجمانی کا نام ہے جن کا تعلق شریف ترین جذباتِ انسانی سے ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی زندگی واقعات اور ہنگاموں سے بھری ہوئی ہے یا یوں کہئے کہ جذبات کے ردِ عمل

---

[1] ان بزرگ کا نام اس لئے ظاہر نہیں کر رہا ہوں کہ موصوف بزرگ نے مجھے اجمالاً سمجھانے کی کوشش کی ہے ہو سکتا ہے کہ کچھ پہلو وہ نظر انداز کر گئے ہوں، اس لئے بہتر یہی معلوم ہوا کہ نام نہ ظاہر کیا جائے تاکہ اگر [illegible] پوچھنے تو وہ میری ذات [illegible]

نام انسانی زندگی ہے، اس سے ان جذبات کی ترجمانی انسانی زندگی کی صحیح تصویر کشی کے لئے ناگزیر ہے۔ یہ وہ جذبات ہوتے ہیں جن سے شاعر کا دل ہر لمحہ دوچار رہتا ہے۔ یہاں پر ہو سکتا ہے کہ راقم سے یہ سوال کیا جائے کہ جذبات کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ آپ کے سوال کا جواب لفظوں میں دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ناممکن اس لئے ہے کہ جس طرح سے دنیا کا کوئی شخص سمندر کی لہروں کو گن کر نہیں بتا سکتا کہ کتنی لہریں اٹھ رہی ہیں، اسی طرح جذبات انسانی کی لفظی تشریح ناممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ ان جذبات کا تعلق قلب انسانی سے ہوتا ہے۔ اس لئے چند لمحوں کے لئے ہم کو قلب کی ماہیت پر غور کر لینا چاہئے۔ یہ انسانی دل اس کائنات کی سب سے زیادہ حیرت انگیز اور تعجب خیز چیز ہے۔ یوں تو عالم موجودات کی تمام اشیا میں تغیر و تبدل ہوا کرتا ہے یہاں کی کوئی چیز مستقل نہیں ہے۔ مگر جس تیزی کے ساتھ انسانی دل بدلا کرتا ہے دنیا کی کوئی دوسری چیز اس طرح نہیں بدلتی میں بات کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا مختصراً عرض ہے کہ ہمارے دل میں سمندر سے زیادہ تموج ہوتا ہے اور کسی وقت کبھی بھی یہ طوفان کم نہیں ہوتا۔ اسی خاموش اور نظر نہ آنے والے سمندر میں جو موجیں اٹھتی رہتی ہیں ان موجوں کو حسین اور موثر الفاظ میں مصور کر دینے ہی کا نام میرے نزدیک تغزل ہے۔ تغزل کے لئے یہ ضروری نہیں کہ حسن و عشق ہی کا تذکرہ کیا جائے یا صرف محبوب ہی کی بات کی جائے۔ بلکہ تغزل کے لئے ضروری یہ ہے کہ شاعر اپنے ان جذبات کو جو اس کے دل میں طوفان اٹھائے رہتے ہیں۔ موثر اور حسین الفاظ میں نظم کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسی شاعری صرف الہامی شاعر ہی کر سکتے ہیں اکتسابی شعرا اس وادی میں قدم نہیں رکھ سکتے۔ فانی الہامی شاعر ہیں اور انھوں نے انسانی دل کے لمحہ بہ لمحہ بدلنے والی کیفیت کو نہایت خوبی کے ساتھ ہر ہر پہلو سے نظم کیا ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں اس دور کے دوسرے شعرا کے مقابلہ میں تغزل زیادہ ہے۔ اگر آپ میرے نظریہ کو قابل قبول سمجھتے ہیں۔ اور آپ اسی نظریہ سے کلام فانی کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ پر ظاہر ہوگا آپ دیکھیں گے کہ فانی کے بیشتر اشعار میں تغزل ہوتا ہے۔ یعنی ان کے بیشتر اشعار جذبات انسانی کے ترجمان ہوتے ہیں۔

میں اپنے پہلے مقالہ "فانی میری نظر میں" عرض کر چکا ہوں کہ وہ ایک نادیدہ حقیقت کی تلاش میں زندگی بھر سرگرداں رہے۔ کبھی کسی چیز کو جلوۂ مقصود سمجھتے کبھی کسی کو۔ ایک شے کی طرف مائل ہوتے اس کا مشاہدہ اور تجزیہ کرتے۔ تجزیہ اور مشاہدہ کے بعد ان پر واضح ہوتا کہ وہ چیز نہیں ہے جس کا میں متلاشی ہوں اور وہ دوسری طرف بڑھ جاتے۔ آخر میں انھوں نے اپنی تگ و دو کا حاصل جو کچھ محسوس کیا اس کو فانی نے ایک شعر میں پیش کیا ہے اور میرے نزدیک یہ بے پناہ تغزل کی مثال ہے ؎

قریب جلوہ اور کتنا کمال اے معاذ اللہ — بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھایا

میں عرض کر رہا تھا کہ فانی کی زندگی اسی تگ و دو اسی تلاش مسلسل سے عبارت ہے۔ اس سفر اس کاوش میں ان کا دل عجیب عجیب جذبات سے آشنا ہوا اور انھوں نے ان جذبات کو شاعرانہ انداز سے نظم کر دیا۔ فانی نے کبھی بھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ دنیا ان کو قنوطیت پسند کر رہی ہے، خود ہر اس جذبہ کو نظم کرنا جو ان کے دل میں طوفان اٹھا دیتا تھا اپنا شاعرانہ فرض سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں دوسرے شعرا کے مقابلہ میں خلوص زیادہ ہے اور یہی خلوص تغزل کا ضامن ہے۔

اب چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں اشعار میں میرے خیال میں تغزل ہے آپ ایک گہری نظر ان اشعار میں ڈال جائیں میرا نظریہ شاید واضح ہو جائے ؎

ادائے تغافل کے مارے ہوؤں پر — ستم بھی کرو گے تو احسان ہوگا

کیا گھائل نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں — دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

ادعائے غم بالکل بجا یکسر درست — اور جو دل کا حال چہرے سے نمایاں ہو گیا

اے جذبہ بے خودی ترے قربان جائیے — پھرتا ہے کوئی دل میں مجھے ڈھونڈتا ہوا

پڑتا نہیں اس آئینہ میں عکس کوئی اور — دل میں تری تصویر ہی رکھدی ہو کسی نے

میری فطرت ہے گوش بر آواز — سن رہا ہوں نوائے محرم کیا

یہ دردِ محبت غمِ دنیا تو نہیں ہے — اب موت بھی جینے کا سہارا نہ رہے گی
مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی — وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا
کیا کیجئے سیرِ باغِ عالم — گل پردہ نشینِ رنگ و بو ہے
تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ — بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا
شعبدے آنکھوں کے کتنے ایسے ہم نے دیکھے ہیں — آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا
وہ دل کی آڑ میں رہتے ہیں فانی — تمنا میرے ان کے درمیاں ہے

اوپر گزر چکا ہے کہ میرے نزدیک صحیح تغزل وہی ہے جو جذباتِ انسانی کی بہترین سے بہترین الفاظ میں ترجمانی کرے۔ اسی نقطۂ نظر سے میں نے مندرجہ بالا اشعار نقل کئے ہیں۔ ان اشعار کی تعداد میں کافی اضافہ کیا سکتا ہے مگر میرے خیال میں مثالوں کیلئے اتنے ہی اشعار کافی ہونگے۔ ان میں بعض بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن میں حدیثِ حسن و عشق بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ خیال ہو کہ میں حدیثِ حسن و عشق کو تغزل سے باہر سمجھتا ہوں ایسا خیال کرنا راقم کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ تاہم یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر حدیثِ حسن و عشق میرے نزدیک تغزل نہیں ہے۔ تغزل کے لئے جذبات کی ترجمانی ناگزیر ہے اور وہی تغزل درخورِ اعتنا ہے جس میں شریف ترین جذباتِ انسانی کی ترجمانی کی جائے۔ تغزل فانی کی شاعری کا ایک تابناک پہلو ہے اور جس فنکارانہ انداز سے انھوں نے ان مضامین کو نظم کیا ہے اس فنکارانہ انداز سے حسرت، اصغر، جگر کوئی بھی نظم نہیں کرسکے ہیں نہ ہی یہ مذکورہ اصحاب کے بس کی بات ہے۔ میرے نزدیک یہ فانی کے عظیم فنکار ہونے کی ساتویں دلیل ہے۔

حرفِ آخر اسی طرح کے دوسرے عنوانات سے فانی کے کلام کی خوبیاں پرکھی جا سکتی ہیں۔ میں نے چند عنوانات سے ان کے کلام کا جایزہ لیا ہے۔ آپ جتنے بھی عنوانات سے ان کے کلام کا جایزہ لیں گے وہ ایک بہترین ہی شاعر ثابت ہوں گے۔ نہ جانے کیسے انکے معترضین یہ کہتے ہیں کہ فانی کی دنیا تنگ ہے مجھے تو فانی کی دنیا میں اتنا تنوع محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہماری زندگی کے ہر ہر پہلو کا احاطہ کرلیتے ہیں یہ ضرور ہے کہ انھوں نے ایک دیوانے کی طرح سے قہقہہ نہیں لگایا ایک غیر ذمہ دار انسان کی طرح ہر وقت دانت نہیں دکھلاتے رہے نہ ہی وہ اتنے بزدل ہیں کہ غم تلخیوں سے گھبرا کر اُس سے صرفِ نظر کرلیں اور "صہبائے خوشگوار" کی تمنا کرنے لگیں۔ فانی غم کو گوارا کرتے ہیں گوارا ہی نہیں کرتے بلکہ جزوِ زندگی بنا لیتے ہیں مگر غم کی تلخی کا احساس بھی انھیں رہتا ہے اور غالباً اسی لئے ایک حقیقت پسند شاعر ہیں۔ فانی کے معترضین ان کے کلام کو خواہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ کہیں، سردار جعفری جیسے جیسے حضرات ان کو اپنی کتابوں میں جگہ نہ دیں مگر جس طرح فانی نے اپنے معاصرین کے رنگِ کلام کو متاثر کیا ہے اسی طرح آیندہ نسلیں بھی ان کے کلام سے متاثر ہوتی رہیں گی۔

عرضِ حال غالباً ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد (۱۹۵۲ء) سے میں کلام فانی کی طرف متوجہ ہوا ہوں۔ اور شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جس دن میں کلام فانی کا کچھ نہ کچھ مطالعہ نہ کرتا ہوں۔ مگر اس کے باوجود عرصہ تک کلام فانی کے بارے میں میرے ذہن میں کوئی ایسا تصور نہ تھا جسے ثبات ہو۔ میرے خیالات اتنے اُلجھے ہوئے تھے اور ان میں باہم اتنا تضاد تھا کہ میں ان کو کاغذ پر منتقل کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ ادھر تین سالوں میں میں نے فانی کو دوبارہ شروع کیا۔ یہ دور میری زندگی کا ایسا ہیجانی دور ہے جو شاید پھر کبھی میری زندگی میں واپس نہ آئے، ان تین سالوں میں اکثر رات رات بھر جاگ جاگ کر فانی سے ہم کلام رہا ہوں اور زندگی اور اس کے اسرار پر ان سے کافی بحثیں کی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ کلام فانی ہی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا ورنہ شاید آج زینتِ صحرا ہوتا یا آغوشِ گور میں تڑپتا ہوتا۔ اس ہیجانی اور عبوری دور میں فانی کی ایک مکمل اور مربوط تصویر میرے سامنے آگئی ہے جسے آپ کے سامنے پیش کردوں گا مگر چونکہ تین سالوں سے فانی مجھے ویسے نظر آرہے ہیں جیسا کہ میں نے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اسی لئے بہتر سمجھا کہ اپنے تاثرات سے دوسروں کو آگاہ کردوں

جو فانی مرحوم نے میری زندگی کی تاریک اور ویران راتوں میں مجھ پر کیا ہے۔ اسی احساس نے مجھ سے یہ مضمون قلم بند کرایا ہے یعنی یہ مقالہ "احساسِ تشکر" کا نتیجہ ہے۔ "اظہارِ ہنر" کا نہیں۔ آخر میں ناظرین سے یہ عرض کرنا ہے کہ آپ بھی اسی نقطۂ نظر سے کلام فانی کا مطالعہ کرڈالیں شاید فانی کی شاعری کی گرہیں آسانی سے کھل جائیں۔

ناول میں حقیقت پسندی

(سید حامد حسین ایم-اے)

کسی سرگزشت کو سننے میں ہم کو جو دلچسپی محسوس ہوتی ہے اس کی بنیاد تین احساسات پر ہوتی ہے - تحیر، تجسس اور مانوسیت - کسی حقیقت کا انکشاف یا کسی تجربہ کا اظہار ہمارے اندر تحیر کو بیدار کرتا ہے - یہ تحیر کا احساس معمولی اجنبی پن سے چونکا دینے والے تعجب تک مختلف مدارج اختیار کرسکتا ہے - مگر اس کی اساس اس دوری کے اساس پر ہوتی ہے جو ہم ذہنی طور پر محسوس کرتے ہیں - یہ دوری زمان و مکان کی واضح دوری بھی ہوسکتی ہے اور تخیلاتی دوری بھی - تخیلاتی دوری سے وہ دوری مراد ہے جو ایک قصہ گو اپنے بیان کے ذریعہ سامع کے ذہن میں پیدا کرتا ہے - سننے والا اس واقعہ سے جو دوسرا شخص بیان کر رہا ہوتا ہے تقریباً ناواقف ہوتا ہے اور وہ اس قصہ میں اس لئے دلچسپی محسوس کرتا ہے کہ ایک ایسا تجربہ یا ایک ایسی روداد جو پہلے سے اس کے تخیلاتی احاطہ میں نہ تھی وہ اس کے لئے اب واضح ہوتی جارہی ہے اور وہ اس سے ایک ذہنی قربت حاصل کر رہا ہے - دوسری چیز تجسس ہے - سرگزشت کہیں سے شروع ہوتی ہے اور ہماری منطقی حس کہتی ہے کہ اس کو کہیں ختم ہونا چاہئے اور جب تک وہ اپنے انجام تک نہیں پہونچتی ہمارا ذہن اس کی درمیانی کڑیاں فراہم کرنے کے لئے بے چین رہتا ہے - اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ واقعات کا سلسلہ خود ایک واضح قسم کی منطقی رفتار سے آشنا ہو بلکہ یہ کام اکثر واقعات کی حرکت اور حادثات سے بھی ہوتا ہے - مگر اس طرح ہم ہر لمحہ اگلے حادثہ اور آنے والے واقعات کے لئے متجسس رہتے ہیں - اس طرح ان میں ایک اندرونی ذہنی سلسلہ باقی رہتا ہے جو دلچسپی کو آغاز سے انجام تک جوڑے رکھتا ہے - تیسرا عنصر مانوسیت کا ہوتا ہے، ہم ان واقعات کے ساتھ پوری دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں جو ہمارے تجربہ سے قریب ہوں - مگر یہ تجربہ محض ہمارا واقعی تجربہ نہیں ہوتا بلکہ ہمارا ذہنی تجربہ یا دوسرے الفاظ میں ہمارا قیاسی تجربہ بھی ہوسکتا ہے - وہ واقعات جو ہمارے قیاس کے احاطہ میں آسکتے ہیں ان سے ہی ہم ایک ذہنی مانوسیت حاصل کرپاتے ہیں اور اسی اندرونی اپنائیت کے احساس میں ہم اس واقعہ کی دلچسپی کو محسوس کرتے ہیں - اس طرح یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم افریقہ کے جنگلات کی کسی مہم سے دلچسپی اس لئے محسوس نہ کریں کہ ہم اس سے واقف نہیں ہیں مگر کیونکہ ہم ذہنی طور پر ان تجربوں کو سمجھ سکتے ہیں، ان کی دشواری اور صعوبتوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں اس لئے وہ ہمارے سامنے دلچسپی کا سامان بن سکتے ہیں اس کے برخلاف ایک سائنس داں کی اس کے معمل (لیبورٹری) میں جدوجہد ہمارے لئے وہ دلچسپی نہیں پیدا کرسکتی جو وہ خود محسوس کرتا ہے کیونکہ ہم اس کے طریق عمل سے واقف نہیں ہوتے بعض اوقات مانوسیت تحیر کے عنصر کو جذب کرکے مافوق الفطرت اور مافوق البشر میں بھی دلچسپی پیدا کرلیا کرتی ہے - مگر یہ بات بھی دھیان دینے کی ہے ایک فوق الفطرت واقعہ میں بھی قصہ گو مانوسیت کے احاطہ سے باہر نکلنا نہیں چاہتا - فرق صرف واقعاتی سطح کا ہوتا ہے - سحر اور ربانی طاقتوں کے ذریعہ وہ ان تجربوں ہی کو پھیلاتا اور عام واقعاتی سطح سے اونچا اٹھاتا ہے جو ہم محسوس کرتے ہیں - طلسم ہوش ربا میں موجود سارے جذبات وہی ہیں جو ہمارے احساس سے قریب ہیں - رشک حسد، رقابت، وفاداری، طاقت اور حکومت کی خواہش - فرق صرف اتنا ہے کہ عوامل مختلف ہیں - یہی محسوساتی مانوسیت ہمیں لقمان کی حکایتوں اور کلیلہ دمنہ کی کہانیوں میں دلچسپی کا احساس دلاتی ہے - یہاں جانور ہم کو انسانوں کی زبان میں بولتے اور انسانوں کی طرح عمل کرتے اتنی اجنبی نہیں محسوس ہوتے وہ اگر ان کہانیوں میں واقعی کسی طرح ہم جانوروں کی صحیح عادات اور حرکات کا اظہار کرپاتے تو وہ کبھی ہمارے لئے اتنی دلچسپ نہیں بن سکتی تھیں -

اس لمبی تمہید سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ فن حکایت (FICTION) میں تحیّر کے لئے تخئیل، تجسس کے لئے تسلسل اور مانوسیت کے لئے حقیقت کی ضرورت ہے۔ یہ چیز افسانہ، ناول اور فواد ڈرامہ ہی کیوں نہ ہو سب کے لئے درکار ہے اور یہی عناصر کچھ مختلف تناسب میں پرانی داستانوں اور کہانیوں میں درکار رہے ہیں۔ مگر ناول کا فن آج داستانوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور افسانوں سے زیادہ پھیلا ہوا ہے ناول داستانوں سے زیادہ عام زندگی، عام تخئیل، عام تجربات سے قربت رکھتا ہے اور فن کے لحاظ سے زیادہ مربوط اور منظم ہے۔ یہ بات افسانہ کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔ مگر یکساں نہیں۔ ناول اور افسانہ میں محض طرز کا فرق نہیں بلکہ دونوں زندگی کے بارے میں زاویۂ نگاہ دو مختلف طریقوں سے رکھتے ہیں۔ ناول زندگی کا ایک بھرپور نقش اجاگر کرتا ہے اس کی پوری ہماہمی کے ساتھ۔ افسانہ صرف ایک تاثر کو اس کی گہرائی کے ساتھ ناول اس طرح زیادہ کڑیوں کو ایک ساتھ اُٹھاتا ہے اور زیادہ بڑے احاطہ میں پھیلاؤ رکھتا ہے اور اس کی حرکت میں افسانہ کی تیزی اور سیدھا پن نہیں ہوتا۔ مگر جو بات یہاں زور دینے کی ہے وہ یہ ہے کہ ناول میں آدرش کے لئے اتنی گنجایش نہیں رہتی جتنی افسانہ میں۔ ناول میں حقیقت سے زیادہ قربت چاہئے۔ افسانہ کا منتہا کسی ایک تاثر کو اس کی شدت میں ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ ناول کا منتہا زندگی کو اس کی پوری رنگارنگی میں پیش کر کے زندگی کے بارے میں مبسوط تبصرہ کرنا ہوتا ہے۔ تاثر کی شدت میں اضافہ کرنے کے لئے ہم آدرش کا سہارا لے سکتے ہیں کیونکہ افسانہ اپنے زیریں تاثر کو ہمارے جذباتی دھارے کے ساتھ لے کر چلتا ہے اور اس کو بھرپور بنانے کے لئے وہ ہمارے جذبات کو آدرش کی بلندیوں پر لے جانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ مگر ناول کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ ناول ہمیں بیک وقت کئی مسئلوں، کئی باتوں کا احساس دلاتا ہے۔ کوئی ایک اندرونی تاثر نہیں ہوتا جس کو ہم پکڑ کر چلیں بلکہ اس کی پوری فضا ہوتی ہے، پورے کردار ہوتے ہیں اور واقعات کی رفتار ہوتی ہے۔ ناول اس طرح ہم کو اپنی ایک طرح کی افسانوی صداقت کے ذریعہ منواتا ہوا چلتا ہے۔ مثال کے طور پر خواجہ احمد عباس کے افسانے "اجنتا" اور پریم چند کے ناول "گئودان" کے اختتام کا موازنہ کیجئے۔ خواجہ احمد کا مرکزی کردار اجنتا پہونچ کر ایک ناتمام غار میں ایک VISION دیکھتا ہے گویا لاتعداد بھکشو اس غار کو بنانے میں مصروف ہیں اور ان کی چھینیوں سے آواز آرہی ہے کام، کام، کام..... اور وہ شخص جو فرار کر کے اجنتا کی طرف آیا ہے محسوس کرتا ہے کہ عمل سے فرار واقعی ممکن نہیں ہے۔ احمد عباس نے اپنے تاثر کو بڑھانے کے لئے اپنے تخئیل سے مدد لی ہے، باوجودیکہ حقیقت سے قریب نہیں ہے پھر بھی افسانہ نے ایک کامیاب نقطۂ عروج حاصل کیا ہے۔ پریم چند کے "گئودان" کا اختتام ہوری کی موت پر ہوتا ہے جہاں اس کی بیوی کے پاس گودان کرنے کے لئے بھی پورے پیسے نہیں ہیں۔ پریم چند نے اپنے اس ناول کے اختتام کے لئے کسی آدرش کا سہارا نہیں لیا ہے، کسی تخئیل کی آرائش سے کام نہیں کیا، واقعات سے ہٹ کر کوئی تمنا نہیں کی، برخلاف اس کے کرشن چند کا ناول "جب کھیت جاگے" ایک تخئیلاتی اڑان پر ختم ہوتا ہے۔ راگھوراؤ ایک سرخ قمیص کی خواہش کرتا ہے، وہ قمیص مہیا کی جاتی ہے۔ پورے گاؤں میں ایک بیداری کی لہر دوڑ جاتی ہے اور اس طرح ناول نگار راگھوراؤ کی پھانسی سے پیدا ہونے والی مایوسی کو دور کرنے کے لئے آدرش کا سہارا لیتا ہے۔ ناول کا پورا تناؤ جو راگھوراؤ کے کردار کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اس طرح ایک دم ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور ناول کی توانائی برقرار نہیں رہتی۔ ناول نگار گویا خود اپنے کردار کے انجام سے متاثر ہو اُٹھتا ہے۔ مگر ناول نگار کا کام تو یہ ہے کہ وہ انجام سے متاثر ہونا پڑھنے والے کے لئے چھوڑ دے۔ اور اس کے لئے واقعات کو ایک فیصلہ کن سطح تک پہونچانے میں مدد دے۔

اس طرح ناول کو آدرش کی بہ نسبت حقیقت سے زیادہ قربت کی ضرورت ہے لیکن اس حقیقت کے معیار کو مقرر کرنے کے لئے ہمیں انھیں تین عناصر کو سامنے رکھنا چاہئے جنھیں ہم پہلے بحث میں لا چکے ہیں۔ "افسانوی صداقت" تحیّر، تجسس اور مانوسیت سے ترکیب پاتی ہے نہ تو ہم ڈائری کو ناول میں منتقل کر سکتے ہیں اور نہ پولیس اسٹیشن کے روزنامچہ کو۔ ان میں تحیّر بھی ہو سکتا ہے اور مانوسیت بھی۔ لیکن تجسس کا پھیلاؤ نہیں۔ زندگی کے بہت سے واقعات بغیر انجام کے رہتے ہیں۔ بہت سے حادثات کے پیچھے کوئی تاثر نہیں ہوتا۔ بہت سے تجربے ہمارے ہم جنسوں سے اتنے یکساں ہوتے ہیں کہ ہمیں اپنے تجربوں میں کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی۔ اس طرح ہمارے ایک دوسرے کے تجربے آپس میں اس قدر قریب ہوتے ہیں کہ کسی قسم کی ذہنی دوری کی گنجایش ہی نہیں پیدا ہوتی اور اس کے نتیجہ میں کوئی تحیّر بھی نہیں

پیدا ہوتا۔ چیسٹرٹن[1] نے ایک بار صحیح ہی کہا تھا کہ اگر ہم اپنی زندگی کی روداد لکھنے بیٹھیں تو ہمارے پاس ناولوں کا ایک انبار طیار ہو سکتا ہے، جن کی صرف پہلی جلدیں موجود ہوں۔ کسی زندگی کو ناول کی صورت میں ترتیب دینے کے لئے ہم کبھی اس کے ساتھ واقعاتی انصاف نہیں کر سکتے اس میں سے ہم کو بہت کچھ رد و بدل، ترمیم و تنسیخ کرنا پڑتی ہے۔ "افسانوی صداقت" اس طرح نری حقیقت نگاری سے کچھ الگ ہے۔ "افسانوی صداقت" میں ہم کو تخئیل کا عمل بھی کرنا پڑتا ہے، اس کے اندر ایک جذباتی وحدت، ایک محسوساتی تسلسل بھی تلاش کرنا پڑتا ہے اور ان کو ہمیں اپنے عام تجربے کے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔

یہ غلط نہیں ہے کہ ناول کے احاطہ میں زندگی کی ہر چیز آ سکتی ہے۔ مگر اس کا مقصد یہ بھی نہیں ہے کہ ناول نگار کی حیثیت محض ایک تماش بین کی سی ہو سکتی ہے جو بازار میں کھڑا ہو کر ناول طیار کر سکتا ہے۔ ناول میں بازار کی ہما ہمی آ سکتی ہے مگر محض ہما ہمی کی حد تک نہیں۔ "افسانوی صداقت" خارجی حقیقتوں کی تہوں کو چیر کر کسی اندرونی وحدت کو تلاش کرتی ہے۔ جس طرح بازار کی وہ چہل پہل جو بظاہر بے ترتیب معلوم ہوتی ہے، ہر فرد کے لئے پوری طرح با مقصد ہے اور اگر ہر شخص اس مقصد کو ختم کر دے جس کے لئے وہ نکلا ہے تو بازار کی رونق بھی نظر نہیں آئے۔ ٹھیک اسی طرح ناول کی پوری فضا اپنے ایک ایک جزو، ایک ایک کردار پر قایم ہوتی ہے اور ناول نگار اس کی انفرادیت سے پڑھنے والے کو واقف بناتا ہے اور اپنی کہانی کے ڈھانچے میں اس کی موجودگی کا جواز پیدا کرتا ہے۔ اگر وہ جزئیات اور کرداروں بغیر کسی اندرونی مقصد کے اکٹھا کئے جاتا ہے تو وہ ناول کی حیاتیاتی حرکت کو اس انبار سے گرانبار کرتا ہے۔ ناول نگار کا کام اس طرح دراصل اس اندرونی رشتہ کو تلاش کرنا اور واضح بنانا ہے جو واقعات کی کڑیوں کو جوڑتا ہے اور کرداروں میں ایک باہمی ربط پیدا کرتا ہے۔ خارجی حقیقت پسندی اس طرح اس داخلی حقیقت پسندی کا وسیلہ ہے جو اکثر علامتی طور پر ان جزئیات کا رشتہ پیدا کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں مکالموں کے استعمال کو لیجئے۔ لہجے اور محاوروں کے اختلاف کو ہم کرداروں کے سماجی مراتب کے تعین میں مدد دے سکتے ہیں۔ مگر اس حقیقت پسندی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی کردار کسی ایسی سرزمین سے متعلق ہے جس کی زبان، اس زبان سے جس میں وہ ناول لکھی جا رہی ہے، مختلف ہے تو اس کے سارے مکالمے اسی زبان میں لکھے جائیں۔ یا اگر کوئی تاریخی ناول چوتھی صدی عیسوی کے ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے تو ناول نگار کو پہلے اس دور کی زبان کو دریافت کرنا چاہئے اور پھر اس کو اپنی ناول کی داغ بیل ڈالنا چاہئے۔ ناول نگار کا اصل مقصد اپنی پوری کہانی سے کوئی تاثر پیدا کرنا ہوتا ہے، اس کا کام دستاویز پیش کرنا نہیں۔ کسی دوسری زبان کے مکالمے، بشرطیکہ وہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں نہ آ سکتے ہوں، خارجی حقیقت نگاری کے اصول کے مطابق ہونے کے باوجود ناول سے دلچسپی کے ایک عنصر، مانوسیت کو کم کر دیتے ہیں۔ اس لئے ناول نگار کی "افسانوی صداقت" اس پر ہی قناعت کر سکتی ہے کہ وہ اہ مکالموں کو اپنی زبان ہی میں ادا کرے۔ ایسے کرداروں یا کسی عہد ماضی کی خصوصیات کو وہ اپنے بیانیہ کے ذریعہ فضا پیدا کر کے پیش کر سکتا ہے۔ عادات و اطوار، طور و طریق اور رسوم و رواج سے مخصوص کر سکتا ہے۔

حادثات سے زندگی خالی نہیں ہے اور حقیقت نگاری حادثات کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ مگر ناول کی صداقت پسندی محض حادثات کے بل پر نہیں چلا کرتی۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں زندگی کے ہر واقعہ سے ہم ناول نہیں ترتیب دے سکتے۔ تجسس واقعات کا ایک اندرونی ربط اور حالات کا ایک داخلی بہاؤ تلاش کرنا چاہتا ہے۔ ناول نگار حقیقت پسند ہوتے ہوئے بھی ایک شطرنج کے کامیاب کھلاڑی کی طرح ہوتا ہے جو اپنا مہرہ اس لئے گنواتا ہے کہ اس کی بازی بگڑے نہیں بلکہ سنورے۔ اچھا ناول نگار اپنے کرداروں کو محض حادثات کے نام پر قربان نہیں کرتا اور نہ ہی کہانی کو حالات کے تغیروں پر چھوڑ دیتا بلکہ وہ ایک خالق کے ناتے اپنی کہانی کے ایک ایک موڑ کو جانتا ہے اور نہیں چاہتا کہ وہ اپنے پیدا کئے ہوئے کرداروں یا واقعات کو ضایع جانے دے۔ وہ ان سے پورا کام لینا جانتا ہے۔ حادثات اس طرح ناول نگار کی کمزوری نہیں ہوتے

---

[1] جی۔ کے۔ چیسٹرٹن کی تصنیف "ڈکنس" میں

بلکہ مصلحت - اور یہ مصلحت شناسی "افسانوی صداقت" کا ہی ایک جزو ہے۔

حقیقت نگاری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انجام انصافِ شعری (Poetic Justice) پر مبنی نہ ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ حق کی ہمیشہ فتح ہو اور شر کی شکست - کیونکہ واقعی زندگی میں ایسا نہیں ہوا کرتا۔ "افسانوی صداقت" کو ایسے کسی قسم کے بھی فارمولے سے بالاتر ہونا چاہئے - ناول نگار کو کوشش کر کے کسی انجام کو پیدا نہیں کرنا چاہئے۔

ناول کا فن قالین بننے کے فن کی سی احتیاط چاہتا ہے۔ جس طرح قالین بننے والا اپنے بیل بوٹوں کو تانے بانے کی مناسبت سے طیار کرتا ہے اور تانے بانے کو بڑھاتے ہوئے ان بوٹوں کا خیال رکھتا ہے اسی طرح ناول نگار کو اپنی "افسانوی صداقت" جو تحیر، تجسس اور مانوسیت پر مبنی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ناول کے پھیلاؤ پر دھیان رکھتا ہے۔

رعایتی اعلان

مذہبی استفسارات و جوابات — من و یزداں — نگارستان — جمالستان — مکتوبات نیاز تین حصے — مذہب
۸ر ۱۲ر عہ ۸ر للعہ عہ

انتقادیات — مالہ و ماعلیہ — حسن کی عیاریاں — شہاب کی سرگزشت — مجموعۂ استفسار و جواب جلد سوم — فلاسفۂ قدیم
للعہ عہ عہ ۸ر عہ عہ

فراست الید — نقاب اُٹھ جانے کے بعد -
عہ ۸ر

میزان
عہ

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف پینتالیس روپے میں مل سکتی ہیں -

منیجر نگار لکھنؤ

بعض نادر کتابیں

(صرف ایک ایک نسخہ موجود ہے)

نظام الملک طوسی - مصنفہ عبدالرزاق کانپوری قیمت علاوہ محصول عہ
البرامکہ ..... " " " " " عہ
دیوان رند لکھنوی ..... للعہ
تذکرہ سراپا سخن ۶ے
کلیات مومن ۶ے

میزان
عہ

یہ تمام کتابیں اگر ایک ساتھ لی جائیں گی تو معہ محصول عہ میں مل سکیں گی چوتھائی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے - منیجر نگار لکھنؤ

نگار کے بعض سالنامے رعایتی قیمت پر

پاکستان جوبلی نمبر - - - ۱ فرمانروایانِ اسلام نمبر
۴ے ۴ے

علوم اسلامی نمبر - - - - مستقبل کی تلاش نمبر
۴ے ۴ے

میزان
عہ ۱۲ر
۴ر

ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول نو روپے میں مل سکتے ہیں - منیجر نگار

مجاز کے شعری رجحانات

(شعیب راہی)

عظیم ہندوستانی عوام کی بیداری کا واحد سبب تحریکِ آزادی ہے، جس نے عوام کی رہنمائی میں آگے بڑھ کر ادیبوں اور شاعروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تمام شعبۂ حیات کے وجود میں ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ایک اہم تبدیلی واقع ہوئی اور اُردو کے عظیم اور لافانی فنکار، غالب، حالی، اقبال اور پریم چند وغیرہ نے ملک کی غلامی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کے اس غیر معمولی شعور اور ان کی فنکارانہ صلاحیتوں نے ادبی رجحانات کی تعیین کی اور اُردو ادب کو عوام کے نزدیک لائے۔ اگر ہم غدر کے پہلے کی اُردو ادب کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیں تو مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے اُردو شاعری کا دامن تنگ نظر آئے گا۔ غزل شاعری کی جان تھی اور غزل گو شعرا مخصوص اہمیتوں کے مالک تھے ۔ غالب نے اس نکتہ کو محسوس کیا کہ نئی اور مقبول عام ہیئت اور صحت مند مواد کی تخلیق کی لیکن ہیئت میں وہ کوئی تنوع نہ پیدا کر سکے۔ اس طرح ان کے عہد تک غزل شاعری کی انتہائی مقبولِ عام صنعت کی حیثیت سے برقرار رہی ۔ غالب کے بعد اقبال کا فن اُردو شاعری کی شاہراہ پر ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ اُردو شاعری کے جدید ترین دور کا آغاز ہے۔ اس دور کی اہم خصوصیت، ٹھیک اقبال کے بعد جسکی ابتدا ہوئی، گہری توجہ کی مستحق ہے۔ اُردو کے کچھ ناقدوں کے خیال میں، یہ موجودہ رجحان جس نے اُردو ادب کو ازحد متاثر کیا، ہر حیثیت سے انقلابی روح کی نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن مجھے اس سے ہلکا سا اختلاف ہے۔ ہم لوگوں کا یہ دور انقلابی نہیں ہے، ہم اس کی نیم انقلابی عہد سے تعبیر کر سکتے ہیں اور بلاشبہ جس کی نمائندگی مجاز کرتے ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری رومان اور انقلاب کا سنگم ہے، جس کی جانب وہ خود اشارہ کرتے ہیں ؎

دیکھ شمشیر ہے یہ، ساز ہے یہ، جام ہے یہ
تو جو شمشیر اُٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

مجاز ساری زندگی لاابالی اور سہل پسند رہے ہیں۔ بنیادی طور پر اور فطری لحاظ سے وہ ایک نغماتی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں نہ اصلاح پسندی کی چیخ ہے نہ بغاوت کا شعلہ۔ بلکہ سازِ مطرب کی ترنم ریزی کا اجتماع ان کے ادب کا لافانی خزانہ ہے۔ ایک پُرشباب محبت کا خواب آفریں گیت ہے جیسے کبھی وہ شاعری کے بالکل روحانی انداز میں گاتے ہیں ؎

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ

لیکن کبھی اس خواب کی شکستہ تعبیر پر انھوں نے آنسو بھی بہائے ہیں ؎

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے گردشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

سرمایہ دارانہ تخریب کے ہاتھوں مجبور کسی جوان کی حقیقی تصویر کا آئینہ دار "آوارہ" ہے - پہلا بند ملاحظہ ہو :-

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربہ در مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ان کی تخلیق احساسات کی لایعنی طوالت اور تخیلات کی تنگ دامانی سے یکسر پاک ہے - ان کا فنِ تغزل (Lyrical Art) زیادہ وسیع، زیادہ گہرا اور انسانی زندگی کے مسایل سے زیادہ وابستہ ہے - یہی سبب ہے کہ ان کے فن کی شاعرانہ ارتقار نے ان کی تخلیق کو مایدار بنا دیا ہے - اُردو کے دوسرے انقلابی شاعروں کے مقابلہ میں مجاز کی انقلابی فکر قدرے مختلف ہے - اُن کے ہاں انقلاب کی گرج ہے اور مجاز کے وہاں انقلاب کا نغمہ - وہ صرف انقلاب کے خوفناک منظر کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے حُسن کو نہیں دیکھتے - یہ انقلاب کا ترقی پسند اور صحت مند نہیں بلکہ رجعت پسند اور مکانیکی نظریہ ہے - مجاز کی غنائی شاعری میں بہار کی پُرامن ٹھنڈک ہے -

اُردو شاعری کے تازہ رجحان نے جو اس سال اُردو شاعروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو جنم دیا جو انگریزی ادب کے رومانی عناصر سے بہت زیادہ فیضیاب ہوئے ہیں - انگریزی شاعری کا رومانی رجحان جس نے ورڈس ورتھ، شیلی، بائرن اور کیٹس کو پیدا کیا، اُردو ادب کے نوجوان شعرا اختر شیرانی، مجاز اور فیض کو بے انتہا متاثر کیا - ورڈس ورتھ کی "لوسی گرے" نے اختر شیرانی کو فیضان بخشا کہ وہ اپنی معرکۃ الآرا نظم :- "بہارِ حسن کا تو گلشنِ شاداب ہے سلمیٰ" - اور - "یہی وادی ہے اے ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی" - تخلیق کریں اور اُردو کے چند نقاد کے مطابق یہ اُردو ادب کی بے انتہا رومانی (Lyrics) ہیں -

اُردو کے دوسرے رومانی شاعروں کے مقابلہ میں مجاز حقیقی معنوں میں ایک ہندوستانی عاشق ہیں - فطری طور پر ایک رومانی شاعر کی حیثیت سے وہ خود کو اپنی محبوبہ کا عاشق ثابت کرتے ہیں - ان کی محبوبہ ہندوستانی دوشیزہ کی سچی تصویر ہے - جس میں ہندوستانی نسائیت کی تمام خصوصیات پنہاں ہیں - ان کی نظمیں "نوجوان خاتون سے" اور "پردہ اور عصمت" مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں اپنی نظم "وطن آشوب" میں وہ فرماتے ہیں :-

آنکھوں میں خوف و یاس ہے، چہرہ اُداس اُداس ہے
عصرِ رواں کی لیلیٰ برقِ فلک کو کیا ہوا !!!!

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اُردو شاعری کی مودودہ طبیعت، انگریزی ادب سے بہت زیادہ اثر پذیر ہوئی ہے - اختر شیرانی کی "سلمیٰ اور ریحانہ" ورڈس ورتھ کی "لوسی گرے" کے علاوہ اور کوئی نہیں ہیں جنھیں اُردو شاعری کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے - ورڈس ورتھ کی انگریز "لوسی" اختر شیرانی کی ہندوستانی "سلمیٰ" ہے - اختر کی "سلمیٰ" کی عکاسی ورڈس ورتھ کے طرزِ عکس کی پیروی ہے - مجاز، شیرانی کی طرح "کبھی کبھی ارم کی مست بہاروں" سے اپنی محبوبہ کے حُسن میں چار چاند لگانا نہیں چاہتے - شیرانی فرماتے ہیں :-

تو حکم دے تو ستاروں کو چھین لاؤں میں
فلک سے ان کے نظاروں کو چھین لاؤں میں
ارم کی مست بہاروں کو چھین لاؤں میں
خدائی کو یہ تماشہ دکھا بھی جا سلمیٰ
بہار بیتنے والی ہے آ بھی جا سلمیٰ

شیرانی کے وہاں محبوبہ سے فرقت کی چبھن کا ایک پر درد احساس ہے - مگر مجاز کے وہاں وصل کا سرور بھی قاری کو مسرور کرتا ہے - مجاز اپنی

نظم "آج کی رات" میں فرماتے ہیں ؎

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات!!!
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات

محبوبہ کے فراق میں یقیناً مجاز نے بھی اشکباری کی ہے۔ ان کی نظم "مجبوریاں" ملاحظہ ہو جس میں وہ فرماتے ہیں ؎

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا

مگر مجاز اس فراق کے اسباب سے بھی بخوبی واقف ہیں ؎

صدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہونچا نہیں سکتا

اور مقصدِ زندگی کے حصول کے لئے اس کو جرأت آمیز قدم اٹھانے کی تلقین فرماتے ہیں ؎

دل میں تم پیدا کرو پہلے مری سی جرأتیں
اور پھر دیکھو کہ تم کو کیا بنا سکتا ہوں میں
آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مجاز اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ سرمایہ دارانہ معاشرت میں کامیاب محبت ہونا ناممکن ہے۔ ایک طرف تو وہ انتہائی فطری اور احساساتی طور پر عشق، حسن اور رومان کے شاعر ہیں، جن کی تنہا دشمن سرمایہ داری ہے۔ دوسری طرف ایک طبقاتی شعور بھی پیدا ہو رہا تھا، جس نے ہمارے ملک میں عوامی بیداری کو جنم دیا۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں عناصر نے مجاز کی شاعری میں انقلابی عنصر کی پیش کش کی۔ یہی سبب ہے کہ گو فطری طور پر وہ ایک رومانی شاعر ہیں مگر ان کی تخلیق میں صرف رومان کی چاندنی ہی نہیں بلکہ حیاتِ انسانی کے اندھیرے بھی ہیں۔ انکی شاعری میں رومان کی پیش کش گہری ایمائیت کی حامل ہے، جہاں وہ اپنی محبوبہ کو مقصدِ انقلاب کے حصول کے لئے اپنے نقشِ قدم پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ ایک نہ ایک دن ہندوستان کے محنت کش عوام اپنے کاندھوں سے سرمایہ داری کا جوا یقیناً اتار پھینکیں گے ؎

پھینک دے اے دوست تو بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب!!!
بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور گاتے ہوئے
اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے

یہ ۱۹۴۲ء کا موقع تھا جب ہندوستان گیر پیمانہ پر انگریزی سامراج کے خلاف تحریک شروع ہوئی۔ ایسے نازک موقع پر مجاز ضبط نہ کر سکے۔ انھوں نے ایک معرکۃ الآرا نظم کی تخلیق کی جو اردو شاعری میں تاریخی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے حکمراں انگریز طبقہ کو ہندوستان چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ انگریزوں کو ایک کہاں تصور کیا اور یہ کہ ہم ہندوستانیوں کی جیبیں بالکل خالی ہو چکی ہیں جبکہ انگریزوں کی جیبوں میں سونے کے توڑے جھڑے ہوئے ہیں۔ اس تخیل کی تصویر کشی، مجاز کے شاعرانہ حسنِ بیان کے ساتھ ان کی نظم "بدیسی مہمان سے" میں دیکھی جا سکتی ہے ؎

مسافر بھاگ وقتِ بیکسی ہے
ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہے
تری جیبوں میں ہیں سونے کے توڑے
یہاں ہر جیب خالی ہو چکی ہے
یہ عالم ہو چکا ہے مفلسی کا
کہ رسمِ میہمانی اُٹھ چکی ہے
مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے
وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہے

اور جب ۱۹۴۷ء کی بہار، اگست کی پندرھویں تاریخ، جو ہماری قومی آزادی کا دن ہے، اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ لائی تو مجاز اپنے تمام شاعرانہ اندازِ بیان کے ساتھ نغمہ سرا ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ آزادی حقیقی آزادی کا پہلا زینہ ہے اور اب جواں سال ہندوستانی عوام انقلاب کی منزل کی طرف گامزن ہیں ؎

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں
یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں
ابھی وہ سعیِ جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں آغازِ کارِ مرداں ہے

مجاز ایک ایسے باشعور فنکار ہیں جن کا فن رومانی اور انقلابی دونوں پہلوؤں کا آئینہ دار ہے۔ یہ عہدِ حاضر سے آگاہی اور شعور کی بالیدگی کا نتیجہ ہے۔ مجاز کی اپنے دور کے ساتھ ساتھ خود اپنی آگاہی اور خود شناسی بھی انھیں اپنے ہم عصر شعرا سے بلند کرتی ہے۔ ان کا یہی شعور ان کی تخلیق میں کہیں کہیں طنز کے پہلو کو بھی اجاگر کرتا ہے ان کا اس نوعیت کا کلام مذہبی تنگ نظری سے بالاتر خود شناسی اور خود آگاہی کے لئے ایک لائحۂ عمل ہے، بنی نوع آدم کے لئے محبت اور بھائی چارے کا پیغام ہے، انسانی خلوص اور پیار کی کھلی دعوت ہے ؎

دیر و کعبہ میں مرے ہی چرچے،
اور رسوا سرِ بازار ہوں میں
کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے
اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں
حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں
نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں

اور اسی غزل میں انھوں نے اپنے نظریۂ عشق کی وضاحت بھی کی ہے۔ ان کا عشق شیلی کی طرح زندگی کا حل ہے، جہاں حیات کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ میر کی طرح مجاز کے عشق میں بھی زندگی کے سرچشمے اُبلتے ہیں ؎

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسی اُلفت کا طلبگار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

اور پھر ؎

سچ تو یہ ہے مجاز کی دُنیا ،
حُسن اور عشق کے سوا کیا ہے

ممتاز حسین لکھتے ہیں :- "بے شک وہ ایک لیریکل شاعر تھا۔ لیکن وہ ایک انقلابی لیریکل شاعر تھا۔ اس کی شاعری کا بیشتر حصہ ایک موسم گل کی رسالت اور اس کی حسن آفریں قوتوں کا طربیہ ہے وہ جو ایک شگاف دنیا کے مزدوروں نے سرمایہ دارانہ نظام کے قلعہ میں ۱۹۱۸ء میں ڈالا تھا اور ایک نئی روشنی پسِ دیوارِ احتساب جھانکی تھی، مجاز کی لیریزم میں اس نئی روشنی کی ایک شوخ کرن بھی جلوہ گر ہے"۔

ان کی جدید نظموں میں "سرمایہ داری"۔ "مزدور کا گیت"۔ "وطن آشوب" اور "فکر" اپنے عہد کی حقیقی نمایندہ ہیں۔ فنکارانہ حُسن اور شاعرانہ رچاؤ کے ساتھ مجاز نے ان نظموں میں اپنے احساسات اور مشاہدات کی عکاسی کی ہے۔ ان کی شاعری بیان و تجربہ کا حسین سنگم ہے جس میں فنکارانہ طرزِ بیان اور تخلیقی شعور نے چار چاند لگا دئے ہیں۔

ان کی زندگی کے آخری ایام ان پر بڑے گراں تھے۔ مہاتما گاندھی کے بے رحمانہ قتل نے ان کے طرب انگیز احساسات میں ایک ناگوار تلخی بھر دی تھی۔ اس سلسلہ کی زندہ تخلیق "سانحہ" ہے جس میں ان کی انسان دوستی کے لافانی عقیدہ کی جھلک ہے اور نوعِ آدم کے لئے خلوص و محبت کا ایک جاوید پیغام ـــ گاندھی جی کی تلخ موت نے ان کی تخلیقی قوتوں کے سوتے کھول دئے ؎

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا
انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا

مجاز بے انتہا شراب کے شایق تھے اور شراب ہی نے انھیں موت کے تنگ و تاریک غار میں ڈھکیل دیا۔ ان کی زندگی کی جانکاہیاں عشق میں ناکامی کے سبب تھیں جس نے ان کے ذہن و عمل کو معشوق کی بجائے شراب کی طرف پھیر دیا۔ اور اس راز سے بخوبی واقف تھے، فرماتے ہیں ؎

آپ کی مخمور آنکھوں کی قسم
میری بے خواری ابھی تک راز ہے

مجاز اپنی موت سے بھی باخبر تھے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

اور اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے ۵ دسمبر ۱۹۵۵ء کو وہ اس دیارِ فانی سے عالمِ جاوداں کی طرف کوچ کر گئے۔ اور ہمارے ذہن میں عرفی کیٹس اور شیلی کی موت کی یاد تازہ کر گئے !!!

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

ریاض - سائنس - فلسفہ - تاریخ - معاشیات - عمرانیات - نفسیات - انجینیرنگ - طب و جراحی اور دیگر فنون کی نادر مطبوعات جس کے تراجم جامعہ عثمانیہ سے شایع ہو چکے تھے اور جن کو سارے ادبی حلقوں میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہو چکی ہے۔ اب قیمتوں میں بغیر کسی اضافہ کے صرف ہم ہی سے مل سکتے ہیں۔

نوٹ ۱- فہرست مُفت بھیجی جائے گی ـــــــ **پروپرائٹر، کتب خانہ حیدری چھتہ بازار - حیدر آباد دکن**

پاکستان والے حسب ذیل پتہ سے فہرست اور کتابیں طلب کریں :-

بک بینڈ ۱۲ محمد بلڈنگ - ہرمزجی اسٹریٹ بندر روڈ کراچی ـــ فون نمبر ۳۶۱۰۹

مشاعرۂ نگار

میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے (غالب)

مارچ کے نگار میں یہ مصرع طرح دیا گیا تھا اور اسی کے ساتھ تفصیل سے یہ بھی میں نے ظاہر کر دیا تھا کہ یہ مصرع کیوں اور کن توقعات کے ساتھ تجویز کیا گیا ہے۔ خیال تھا کہ مئی کے پرچہ میں غزلوں کا انتخاب شایع ہو سکے گا، لیکن افسوس ہے کہ یہ خیال پورا نہ ہو سکا اور زیادہ بہتر غزلیں حاصل کرنے کے لئے ایک اور تجویز ذہن میں آئی اور وہ یہ کہ مختلف مقامات میں اسی طرح پر باقاعدہ بزم مشاعرہ طلب کی جائے، چنانچہ ۱۸ مئی کو سب سے پہلے بھوپال میں مشاعرہ منعقد ہوا اور بہت سے مقامی و بیرونی شعراء نے اس میں حصہ لیا۔ یہ مشاعرہ ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا اور باوجود اس کے کہ وہاں کے بعض کہنہ مشق شعراء میں باہم کافی اختلافات پائے جاتے ہیں، ان سب نے بڑی حد تک اشتراک عمل سے کام لیا۔ اسی سلسلہ میں ایک مشاعرہ جولائی کے پہلے ہفتہ میں انجمن فردوسِ ادب کی طرف سے لکھنؤ میں طلب کیا گیا ہے۔ اس کے بعد رامپور میں بھی کوشش کی جائے گی۔ پھر ہونا تو یہی چاہئے تھا کہ لکھنؤ اور رامپور کے مشاعرہ تک اشاعت انتخاب کو ملتوی رکھا جاتا، لیکن چونکہ یہ بات بڑی دیر طلب تھی، اس لئے التوا مناسب نہ سمجھا گیا اور اشاعتِ حاضرہ میں اس وقت کی تمام موصول شدہ غزلوں کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔

اس وقت تک ۲۷۵ غزلیں مل چکی ہیں، اور میں حد درجہ شکر گزار ہوں ان تمام حضرات کا جنھوں نے اس مشاعرہ میں حصہ لیا، لیکن افسوس ہے کہ غالب حصہ غزلوں کا انتخاب میں نہ آ سکا۔ جن شعراء کی غزلیں قابلِ انتخاب نظر آئیں، ان کو ردیف وار پیش کیا جا رہا ہے — مشاعرۂ بھوپال کی غزلوں کو علیحدہ شایع کیا جا رہا ہے۔

سب سے اخیر میں میری غزلیں ہیں جن کا انتخاب میں نے نہیں کیا اور اس خدمت کو میں نے قارئینِ نگار پر چھوڑ دیا ہے۔ (نیاز)

اطہر کھنڈوی :-

بشوق کی ہو دستگیری، یا جنوں کی رہبری
اس کی محفل تک مجھے کوئی تو پہونچا جائے ہے

اعجاز احمد (علیگڈھ) :-

وحشتِ دل تو وہی ہے پر تصور آپ کا
گوشہ گوشہ دامنِ صحرا کا مہکا جائے ہے

اکرم دھولیوی :-

کون کس کے واسطے اے دوست ہوتا ہے خراب
سچ ہے دل ہی خود فریبِ آرزو کھا جائے ہے

کیا ہماری صبح و شامِ زندگی تیرے بغیر
صرف اتنا جانتے ہیں وقت گزرا جائے ہے

اکرم اپنے حال پر میں خود بہت حیران ہوں
کیا بتاؤں کس نظر سے مجھ کو دیکھا جائے ہے

ساحر بھوپالی :-

اتنا ہی نزدیک تجھ کو پا رہا ہوں دل سے میں
جس قدر او بے وفا تو دور ہوتا جائے ہے

جب کمی محسوس ہوگی ان کو میری ہر جگہ
وہ زمانِ ہجر بھی نزدیک آیا جائے ہے
ہو کے شرمندہ کوئی مائل ہو جس دم لطف پر
بے خودیِ شوق میں پھر کس سے سنبھلا جائے ہے

نصیر پرواز صدیقی :-

ہوں تو میں واقف مآلِ غم کی عظمت سے مگر
آدمی پھر آدمی ہے غم سے گھبرا جائے ہے
آج تو جی بھر کے رو لینے دے مجھ کو اے ندیم
جس قدر رکتے ہیں آنسو درد بڑھتا جائے ہے

حمید ناگپوری :-

تذکرہ اُس زلف و رخ کا جب بھی چھیڑا جائے ہے
زندگی کا ایک بھولا خواب یاد آجائے ہے
مسکرا کر پیار کی نظروں سے یوں پیہم نہ دیکھ
دل بہت جلدی فریبِ دوستی کھا جائے ہے

حیات لکھنوی :-

لطف کی زحمت نہ فرماؤ ستاتے ہی رہو
دل بہر صورت محبت کا مزہ پا جائے ہے
رخصتِ فریاد ہی دو، دادِ محرومی نہ دو
اب تو دردِ اک موت کی تصویر بنتا جائے ہے
اے دلِ آخر کچھ وفا کا پاس ہونا چاہئے
بیخودی میں لب پہ کس کا نام آیا جائے ہے
مٹ گیا میں اس ادائے عذر خواہی پر حیات
ان کی آنکھیں، اور آنسو کس سے دیکھا جائے ہے

رازِ یزدانی :-

دیدنی ہوتی ہے پاسِ وضع کی وہ کشمکش
جب کبھی طرزِ تغافل سے وہ اکتا جائے ہے
راز کیا سمجھے کوئی خلوت سرائے دوست کا
آپ وہ کھو جائے ہے جو راز اسے پا جائے ہے

سیفی گنوری - ام - اے :-

دوریٔ فرقت میں اُس کی یاد ہے شمعِ حیات
غم کی راہوں سے بھی دل تک روشنی آجائے ہے

شارق میرٹھی :-

ساری دُنیا جب غمِ دوراں سے گھبرا جائے ہے
آپ کا دیوانہ تو اس دم بھی ہنستا جائے ہے
اک گھڑی ایسی بھی آتی ہے تصور میں ترے
خود اپنے جی سے تیرا حال پوچھا جائے ہے
پوچھتے کیا ہو دل غم آشنا کے حوصلے
یہ سفینہ وہ ہے جو طوفاں سے ٹکرا جائے ہے

شفقت کاظمی :-

دیر تک مفہومِ آس کا سوچتا رہتا ہوں میں
میرے حق میں زیرِ لب جو کچھ وہ فرما جائے ہے

گامزن ہوں جس قدر میں گرم رفتاری کے ساتھ — فاصلہ اُس راہ کا اتنا ہی بڑھتا جائے ہے
سننے والا خود بخود مطلب سمجھتا جائے گا — کہنے والا اپنے غم کا حال کہتا جائے ہے

شاہ ظفر (کلکتہ) :-

غیر سے جب شکوۂ جورِ فلک کرتا ہوں میں — جانے کیا کچھ سوچ کر دل میں وہ شرما جائے ہے
دل کا قصہ بھی عجب تاثیر رکھتا ہے ظفر — کہتے کہتے گریۂ بے اختیار آجائے ہے

عطا محمد شعلہ (ٹانڈہ) :-

ہائے اس کمبخت دل کا کیا کروں؟ یہ ناصبور — جتنا بہلاتے ہیں اُتنا ہی مچلتا جائے ہے
جب کبھی زہرِ غمِ ایام کی چھڑتی ہے بات — جانے کیوں میرے لبوں پر تیرا نام آجائے ہے

شور۔ پرتابگڈھی :-

سچ تو یہ ہے زندگی کا فلسفہ تیرے بغیر — جتنا سلجھاتا ہوں اتنا ہی اُلجھتا جائے ہے

شفیق جونپوری :-

ہائے کیا یوں ہی گزر جائیں گے دن برسات کے — کب ستمگر آئے گا ساون تو بیتا جائے ہے
کیونکر اُس جانِ حیا کو بے تکلف کیجئے — سامنے آئینہ آئے ہے تو شرما جائے ہے
فرشِ گل ہو یا ہوائے خلد کے جھونکے مگر — آپ یاد آجائیں تو پھر کس سے سویا جائے ہے
صبحدم وہ شکر کے سجدے نہ بھولیں گے شفیق — جب ہوائے کوئے جاناں دل کو بہلا جائے ہے

عشرت قادری :-

شمع بجھتی جا رہی ہے، چاند ڈوبا جائے ہے — ساتھ مجھ بیمارِ غم کے کس سے جاگا جائے ہے

فراق گورکھپوری :-

ہو تصور کا بُرا یوں کوئی یاد آجائے ہے — شام ہی سے آج تو دل ہے کہ بیٹھا جائے ہے
کر گئی افسردہ دل کو جس دم آئی بوئے دوست — یہ کلی بادِ بہاری سے بھی کمھلا جائے ہے
یہ سرِ بزم ایک مبہم سا اشارہ کیا کروں، — اب نہ بیٹھا جائے ہے مجھ سے نہ اُٹھا جائے ہے
یہ ادائے عروسانہ یہ تقریبِ وصال — شرم بڑھتی جائے ہے گھونگھٹ بھی اُٹھتا جائے ہے
نرگسیں سرشار کا عالم نہ پوچھو بزم میں، — جس طرف دیکھے ہے دو اک جامِ چھلکا جائے ہے

کوکب شاہجہاں پوری :-

آج پھر شاید اُنھیں کچھ آرہی ہے میری یاد — آج پھر کمبخت دل پہلو سے نکلا جائے ہے

مانی جائسی :-

ضبط ناممکن ہے رسوا ہو رہا ہے رازِ عشق — بہتے ہیں آنسو اور اک طوفان اُٹھتا جائے ہے

کیا جنوں ہے پھر درِ زنداں سے ٹکراتا ہوں سر
جنگلوں میں پھرتے پھرتے دل جو گھبرا جائے ہے

موت آئی اور تصور آپ کا رخصت ہوا
جیسے منزل تک کوئی رہ رو کو پہونچا جائے ہے

ترکِ اُلفت کا کوئی امکاں نہیں کیا کیجئے
لاکھ سمجھاؤں مگر دل ہے کہ بہلا جائے ہے

محوی صدیقی :-

اے زمانے کی ہوائے تُند جھونکا ایک اور
شوق ہر مشکل سے ہر منزل سے بڑھتا جائے ہے

پنڈت انند نرائن ملا :-

میکدے میں آئے ہے ہر شام واعظ بہرِ پند
چشمِ ساقی کا کہیں خالی نشانا جائے ہے

حاصلِ دُنیا و دیں ہے شیخ کا طرزِ حیات
ہر خطا کے بعد اک سجدہ بھی ہوتا جائے ہے

زیست ہے صدیوں کے نقاشوں کا اک نقشِ عظیم
اپنی اپنی جا ہر اک کچھ رنگ بھرتا جائے ہے

کوششیں ہیں دشت کھنچ آئے گلستاں کی طرف
اور گلستاں ہے کہ سوئے دشت کھنچتا جائے ہے

ہے یہی رسم اِس چمن کی ہر نیا بادل یہاں
بن کے نیساں آئے ہے اور آگ برسا جائے ہے

شاخِ گُل گلپوش ہو۔ اِس کو نہیں کہتے بہار
جب یہ رُت آئے ہے کانٹے پر کلی آجائے ہے

اِس طرف امن و بقا اور اُس طرف جنگ و فنا
دیکھئے یہ کارواں کس سمت ملا جائے ہے

نظیر جمیلی :-

لذتِ جاں پرورِ دردِ محبت ، کچھ نہ پوچھ
ربط اک نامہرباں سے پھر بڑھایا جائے ہے

یوں کسی سے اب ہوا کرتی ہیں باتیں پیار کی
خود ہی کہتا جائے ہے دل خود ہی سنتا جائے ہے

عبدالحفیظ نعیمی (پیلی بھیت) :-

کہہ تو دوں بادہ کشو جو راز اُن نظروں کا ہے
لیکن اس سے اعتبارِ جام و صہبا جائے ہے

تم نے خود نظریں جھکا کر کر لیا کیوں اعتراف
لب پہ تو بے اختیاری میں بھی نام آجائے ہے

غفور انیس :-

آج پھر وہ شعلہ پیکر یاد آئے ہے انیس
پھر لہو بے ساختہ آنکھوں سے ٹپکا جائے ہے

نور نظامی :-

قافلے صدہا لٹے کیا کیا ہوئی غارت گری
پھر بھی تیری رہگذر میں نور تنہا جائے ہے

وحید بریلوی :-

کیا وفا کے ساتھ لازم ہے جفا کا تذکرہ
میرے غم کے ساتھ تیرا نام کیوں آجائے ہے

مشاعرۂ بھوپال

اختر سعید خاں اختر :-

ایک ایک غمخوار میرا مجھ سے چھوٹا جائے ہے
کوئی دم میں صبح کا تارا بھی ڈوبا جائے ہے

پھر کوئی دامن ہو یا اپنا گریباں ایک ہے
آدمی جب انتہائے غم سے گھبرا جائے ہے

تو نہیں تیرا تصور بھی نہیں پھر کون ہے
یہ جو شمع زندگی کی لو بڑھاتا جائے ہے

زخم وہ دل پر لیا ہے چارہ گر میں نے کہ بس
یہ دکھایا جائے ہے مجھ سے نہ دیکھا جائے ہے

دل گیا تو بے حقیقت زندگی کا ذکر کیا
کوئی دن میں بوجھ یہ بھی سر سے اترا جائے ہے

محمد امین ادیب ترمذی :-

کل وہی میری وفائیں یاد کر کے روئیں گے
آج رونے پر مرے جن کو ہنسی آجائے ہے

ارشد صدیقی ساگری :-

ماورائے وسعتِ عالم بھی ڈھونڈے ہے سکوں
آدمی جب انتہائے غم سے گھبرا جائے ہے

گاہے گاہے عشق میں درکار ہے تازہ ستم
دل نوازش ہائے پیہم سے بھی گھبرا جائے ہے

اشرف جہاں :-

کھیل اک مدت سے یہ گلشن میں کھیلا جائے ہے
اک کلی کھلتی ہے اور اک پھول مرجھا جائے ہے

اظہر سعید :-

اے نگاہِ لطف ہم آشفتہ حالوں کو نہ چھیڑ
دل زیادہ مہربانی سے بھی گھبرا جائے ہے

وہ جو تھی اک حسرتِ دردِ مسلسل اب بھی ہے
یوں تو ہر غم دل کو تھوڑی دیر تڑپا جائے ہے

جانے کن ہاتھوں نے رکھی ہے بنائے شہرِ دل
جتنا یہ کمبخت بستا ہے اجڑتا جائے ہے

اویس کاوش سیہوری :-

زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آجائے ہے
زندگانی موت سے خود بڑھ کے ٹکرا جائے ہے

باسط بھوپالی :-

دیدنی ہے حاصلِ افسانۂ بزمِ نشاط
شمع روتی جائے ہے پروانہ جلتا جائے ہے

چارہ گر شرحِ عذابِ دردِ تنہائی نہ پوچھ
زندگی کی تلخیوں سے موت شرما جائے ہے

دیر پا راحت نہیں تو مستقل غم ہی سہی
انتہائے یاس میں بھی صبر سا آجائے ہے

مانعِ آہ و فغاں ہے شرمِ رسوائی مگر
سعیِ ضبطِ غم سے باسط دل جو گھبرا جائے ہے

حامد سعید خاں حامد :-

کچھ نہیں اک خواب رنگیں کے سوا کچھ بھی نہیں
دل مسلسل جن امیدوں میں الجھتا جائے ہے

ہمنفس تو ہجر کی افتاد سے واقف نہیں
ایک دن میں دل لگانے کا مزہ آجائے ہے

فطرتِ مختار کی مجبوریاں پھر دیکھئے
جب کوئی دیوانہ اپنے ہوش میں آجائے ہے

تھک چکا ہوتا کبھی کا رہروِ منزل مگر
آپ کا نقشِ قدم ہمت بڑھاتا جائے ہے

دانش مالوی (سرونج) :-

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا ترے غم کا کرم
انتہا یہ ہے کہ مجھ کو صبر آتا جائے ہے

کر دیا دیوانگی نے محو احساسِ الم
اب تو رونا چاہتا ہوں اور ہنسی آجائے ہے

ذکری بھوپالی :-

جس کو طوفاں خیز موجوں سے بچا لایا تھا میں
وہ سفینہ سامنے ساحل کے ڈوبا جائے ہے

رمزی ترمذی :-

اُس کا نقشِ پا جہاں مجھ کو نظر آجائے ہے
شوق سجدوں سے وہاں کعبہ بناتا جائے ہے

ہم عوض جاں کے ازل سے جس کو لیکر آئے ہیں
جیتے جی ناصح بھلا سر سے وہ سودا جائے ہے

زرہ (سرونج) :-

ذوقِ دیدار و ناامیدی شوق وصل اور نارسی
کارواں اپنا یہ کس منزل میں ٹھیرا جائے ہے

سرور بھوپالی :-

اس مقامِ عشق کو کہتے ہیں کیا اہلِ نظر
وہ کرم فرما ہیں لیکن درد بڑھتا جائے ہے

چاہتا ہوں بھول جاؤں لیکن اس کا کیا علاج
دل تڑپتا ہے تو لب پر تیرا نام آجائے ہے

شعری بھوپالی :-

راہِ غم کی غالباً یہ خاص منزل ہے جہاں
روتے روتے یک بیک مجھ کو ہنسی آجائے ہے

کیا قیامت ہے فریبِ وعدۂ فردائے دوست
شوقِ جلوہ، قیدِ بے میعاد بنتا جائے ہے

الحذر ضبطِ محبت ، الاماں تاثیرِ درد
کون دیکھے اُس کو غمگیں، کس سے دیکھا جائے ہے

شفا گوالیاری (بھوپال)

چھین لیتے ہیں نگاہیں دیکھنے والوں کی وہ
دیکھ کر اُن کو بھلا پھر کس کو دیکھا جائے ہے

اے خوشا اس صید کی قسمت جسے ازراہِ ناز
ذبح کرتا جائے ہے وہ اور بٹتا جائے ہے

گرمیٔ آرائشِ حُسنِ خود آرا دیکھ کر
اک پسینہ سا رخِ آئینہ پر آجائے ہے

کیا گزر جاتی ہے کانٹوں کے دلوں پر دیکھئے
آج پھر دیوانہ چھٹ کر سوئے صحرا جائے ہے

اے شفا اس سے نہ مل سکنے کی مانگی ہے دعا
آہ مجھ کمبخت پر ایسا بھی وقت آجائے ہے

شہاب اشرف :-

دل کے ویرانے پہ سناٹا سا جب چھا جائے ہے
دفعتاً آواز تیری دور سے آجائے ہے

دیکھ آتے ہیں ترے دیوار و در حسرت سے ہم
جب بہت دل ہجر کے صدموں سے گھبرا جائے ہے

طرزی بھوپالی :-

ہا رہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ راہِ شوق میں
پاؤں اُٹھتا ہے کہ منزل سامنے آجائے ہے

ظفر نسیمی :-
دیکھئے وہ ملتفت ہوں کس کے حالِ زار پر — داستاں ہر ایک اپنی اپنی کہنا جائے ہے
وہ ہمیں تھے جس نے کی صحنِ چمن میں روشنی — ورنہ اپنا آشیانہ کس سے پھونکا جائے ہے

عزیز :-
میں سمجھتا ہوں کہ اب ٹوٹا سکوتِ شامِ غم — جب کبھی دل کے دھڑکنے کی صدا آجائے ہے
آہ یہ رنگِ بہارِ گلشنِ احساسِ شوق — ہر کلی کھلنے سے کچھ پہلے ہی مرجھا جائے ہے

عظمت بھوپالی :-
کیا زمانے کی شکایت کیا تباہی کا گلہ — یہ تو سب ہونا ہی تھا جو آج ہوتا جائے ہے
خونِ دل چھڑکے ہوئے عظمت زمانہ ہوگیا — کب بہار آتی ہے ویرانے میں دیکھا جائے ہے

قیصر درّانی بھوپالی :-
جانے کیا دیکھا ہے دیوانے نے انکی بزم میں — مسکراتا جائے ہے آنسو بہاتا جائے ہے

کامل ناگپوری :-
انقلاب آئے کہ طوفانوں سے ٹکرائے مگر — کاروانِ زندگانی ہے کہ بڑھتا جائے ہے

کیف بھوپالی :-
میکشو آگے بڑھو!! تشنہ لبو آگے بڑھو!! — اپنا حق مانگا نہیں جاتا ہے چھینا جائے ہے

منیر بھوپالی :-
وہ نگاہیں جن سے گلشن میں بہار آجائے ہے — جب بدلتی ہیں تو اک اک پھول کھلا جائے ہے
یوں تو ہر لمحہ محبت کا ہے اک راحت مگر — درد جب اُٹھتا ہے جینے کا مزا آجائے ہے
مقتضائے مصلحت ہے ڈال لے منہ پر نقاب — اب مریضِ عشق کو کچھ ہوش آتا جائے ہے
اب نہ وہ صحرا نوردی ہے نہ وہ جوشِ تلاش — جب خیال آتا ہے منزل سامنے آجائے ہے

میر عرفانی (سروج) :-
اہلِ محفل کی نگاہیں ڈھونڈتی ہیں میر کو — یوں تو جانے کو تری محفل میں دُنیا جائے ہے

ناطق مالوی (سروج) :-
شوقِ گلچینی کا یہ عالم کہ بڑھتے ہی چلو — اور دامن ہے کہ کانٹوں سے اُلجھتا جائے ہے
سوزِ دل سے ہر نفس آتی ہے تازہ بوئے دوست — غنچہ جتنا کھلتا جاتا ہے مہکتا جائے ہے
خانہ ویرانی سلامت، اب تو اپنا ہر خیال — ایک خوابِ حسرتِ تعمیر بنتا جائے ہے

نیاز فتحپوری
(شعراء متقدمین کے رنگ میں)

جب قفس میں مجھ کو یادِ آشیاں آجائے ہے — سامنے آنکھوں کے اک بجلی سی لہرا جائے ہے
میرے اوراقِ کتابِ زندگانی ہائے ہائے — جیسے بن دیکھے کوئی ان کو اُلٹتا جائے ہے

دل مرا وہ خانۂ ویراں ہے، جل بجھنے پر بھی
راکھ سے جس کی دھواں تا دیر اٹھتا جائے ہے

میں نہ کہتا تھا کہ تابِ دید کا کیا اعتبار
آج لے، اے دل ترا یہ بھی سہارا جائے ہے

تم تو ٹھکرا کر گزر جاؤ، تمھیں ٹوکے گا کون،
میں پڑا ہوں راہ میں تو کیا تمھارا جائے ہے

چشمِ تر ہے اس طرف اور اُس طرف ابرِ بہار
دیکھنا ہے آج کس سے کتنا رویا جائے ہے

اُف ری محرومیِ مری، سنتے ہی نامِ آشیاں
شاخ کا کیا ذکر سارا باغ تھرا جائے ہے

ہائے جو گھر رات بھر جلتا رہا ہو، صبحدم
اس کی ویرانی کا منظر کس سے دیکھا جائے ہے

میں تو بس یہ جانتا ہوں اس کو ہونا ہے خراب
کیا خبر اس کی مجھے، دل جائے ہے یا آئے ہے

کون ہے دُنیا میں اب مجھ سے زیادہ نامراد
ہائے وہ "میں" جو تری نظروں سے گرتا جائے ہے

شمعِ محفل جل بجھی، پر یادگارِ بزمِ دوش
جا بجا اب بھی پرِ پروانہ پایا جائے ہے

ہاں، اسی کو لوٹ کر آنا نہیں ہوتا نصیب
تم سے پھر ملنے کی جو لیکر تمنا جائے ہے

میرا پندارِ خدائی اس گھڑی دیکھے کوئی
جب مجھے بندہ ترا کہکر پکارا جائے ہے

آچکے وہ آؤ ہم بھی آنکھ جھپکا لیں نیازؔ
صبح کا تارہ بھی اب تو جھلملاتا جائے ہے

(مومنؔ و غالبؔ سے لیکر مصحفیؔ، جرأتؔ، جعفر علی خاں حسرتؔ، دانشؔ، جلالؔ، نسیمؔ، داغؔ و حسرتؔ موہانی تک)

منزلِ خود آگہی کا قرب بڑھتا جائے ہے
ہوش کھوتا جائے ہے، پردہ سا اٹھتا جائے ہے

قصۂ کشتی و ساحل! ناخدا تو ہی بتا
کون ان دونوں میں کس سے دور ہٹتا جائے ہے

جو نہ مرنے دے نہ جینے دے، دمِ رخصت وہ شوخ
اک نگہ ایسی بھی ہم پر صرف فرما جائے ہے

راستہ جو دیر کو جاتا ہے اے شیخِ حرم
جائے ہے کعبہ کو بھی وہ اور سیدھا جائے ہے

التفاتِ دوست مانا وجہِ تسکیں ہے مگر
ہاتھ رکھ کر وہ تو دل کو اور تڑپایا جائے ہے

اے وہ نقشِ نامرادی ہی سہی، پر کیا کروں
بیٹھ کر محفل میں اس کی کس سے اٹھا جائے ہے

محو ہو جاتے ہیں سارے شکوہ ہائے دردِ دل
سامنے جس دم وہ جانِ آرزو آ جائے ہے

جاں گسل ہے گو بہت ترکِ محبت کا خیال
لیکن اس پیماں شکن کو یوں بھی چاہا جائے ہے

اس میں ہے کوئی صنم محوِ گرانخوابی ضرور
ورنہ کیوں سنگِ حرم پر سر جھکایا جائے ہے

حسن کا ہوگا تعلق دیکھنے سے بھی ضرور
اپنے مشرب میں تو اس کو صرف سمجھا جائے ہے

بتکدہ اور کعبہ ان دونوں میں کتنا فرق ہے
بتکدہ بنتا ہے خود کعبہ بنایا جائے ہے

کرکے توبہ دیر سے جاتا ہوں جب سوئے حرم
دیر تک خود کعبہ آکر مجھ کو پہونچا جائے ہے

ذوقِ تخلیق برہمن کی بلندی دیکھئے
بت بناتا جائے ہے، سجدہ بھی کرتا جائے ہے

انتظار ان کے کرم کا ہے کچھ ایسا انتظار
کھنچ نہیں سکتا ہے، لیکن پھر بھی کھنچا جائے ہے

تو کہ ہے ہر نقشِ پا تیرا چراغِ رہگذر
مجھ سے چھپ چھپ کر کہاں راتوں کو جایا جائے ہے

(مرکب تشبیہات اور سخن گسترانہ تعبیرات)

صرف اک لرزش ہے نوکِ خار پر شبنم کی بوند
پھر بھی اس فرصت پر اسکی مجھ کو رشک آجائے ہے

میری تنہائی نہ پوچھو، جیسے کوئی نقشِ پا
دور صحرا کے کسی گوشہ میں پایا جائے ہے

سنگ کیا ہے بس سراپا انتظار بت تراش
زندگی کا خواب لو گویوں بھی دیکھا جائے ہے

شب کا وہ پچھلا پہر اور پھیکی پھیکی چاندنی
رات بسکر جیسے کوئی ہار کمھلا جائے ہے

اس تصور سے کہ میرے ان کے لب ہوں متصل
ایک نقطہ پر سمٹ کر زندگی آجائے ہے

رات کی تنہائیاں اور ان کی آمد کا خیال
چاند جیسے روح کے اندر سے گزرا جائے ہے

اُس سہی قد کا خرامِ ناز وہ فتنہ ہے جو
ہر قدم پر اک نئے سانچہ میں ڈھلتا جائے ہے

ان کی آنکھوں کا تبسم آج رکتا ہی نہیں
ساغرِ لبریز جیسے کوئی چھلکا جائے ہے

اب وہ یاد آتے ہیں تو اس طرح یاد آتے ہیں وہ
جیسے کوئی شعر دل میں گنگنایا جائے ہے

اب یہ حالِ دل ہے جیسے رکھ کے کانٹوں پر نیاز
ریشمی چادر کو بیدردی سے کھینچا جائے ہے

(محبوب کا جسمانی تصور اور محاکات و معاملات)

ہاتھ سے لیتی ہے اُس کے اور لوٹا جائے ہے
ورنہ مہندی میں کہاں یہ رنگ پایا جائے ہے

ہو برا تیرا نگاہِ شوق وہ جانِ حیا
دیکھ تو کیسا پسینہ میں نہایا جائے ہے

وہ خنک سی تابناکی اس کے رنگِ جسم کی
مجھ کو تر اس چاندنی میں نیند سی آجائے ہے

یہ تناسب ہے ترے اعضا کا یا جوشِ شباب
جتنا بڑھتا جائے ہے، کانٹے پہ تلتا جائے ہے

بے حجابی کا بھلا کیا ذکر میرے سامنے
جب وہ گزرے ہے تو اور آنچل کو ڈھرا جائے ہے

مجھ کو مارا ہے اسی نوخیز نے، ہاں ہاں وہی
جو دبا کر دانت سے آنچل کا کونا جائے ہے

ہم سنانے کو سنا دیں داستانِ غم مگر
کس سے ان بھیگی ہوئی پلکوں کو دیکھا جائے ہے

اُف رے وہ ٹھنڈا سا اور ہلکا سا نم جو بعد غسل
سوکھ جانے پر ترے بالوں میں پایا جائے ہے

حاصلِ صد غم محرومی ہے وہ یک قطرہ اشک
جو سرِ مژگاں پہ اس کافر کے پایا جائے ہے

اس نگاہِ شرمگیں کی برق سامانی نہ پوچھ
جو اچٹ کر آئینہ سے ناگہاں آجائے ہے

آنکھ ملتے آرہے ہیں، خوابگہ سے بزم میں
تیر پہلا دیکھئے کس پر چلایا جائے ہے

(جدید رجحانات کو سامنے رکھ کر)

تار کی جھنکار ہی سے بزم تھرّا جائے ہے
گاہے گاہے سازِ ہستی یوں بھی چھیڑا جائے ہے

قافلہ چھوٹے زمانہ ہوگیا لیکن ہنوز
یادِ آوازِ جرس رہ رہ کے تڑپا جائے ہے

چاہے طوفاں بن کے آ، پر ناخدا بن کر نہ آ
اے خدا اس نام سے دل میرا تھرّا جائے ہے

خود زمانہ رخ ہمارا دیکھتا ہے، ہم نہیں
جس طرف مُڑتے ہیں ہم دھارا بھی مُڑتا جائے ہے

سر جو گردن پر نہیں تو کیا، ہتیلی پر سہی،
منزلِ عشق و جنوں سے یونہی گزرا جائے ہے

روشنی ہی روشنی ہے، عہدِ برق و نور ہے،
یہ مگر سایہ سا کیوں دُنیا پہ چھایا جائے ہے

ہم کہاں ڈوبے تھے یہ کل پوچھیے گا آج تو
کچھ تلاطم سا مگر موجوں میں پایا جائے ہے

مشورہ کچھ ہم سے مجبوروں کا بھی لیلےٰ ضرور
اے خدا عالم اگر پھر سے سنوارا جائے ہے

عقل والو کچھ کہو، یہ رشتۂ رازِ حیات
کیوں الجھتا جائے ہے جتنا کہ کھلتا جائے ہے

کل اسی آہنگ پر ہونا ہے تعمیرِ فغاں
آج جو کچھ زیرِ لب دیوانہ کہتا جائے ہے

آرہا ہوں دوستو، ٹھیرو، مگر یہ تو بتاؤ
مجھ کو کس گوشہ سے صحرا کے پکارا جائے ہے

میں ہوں وہ رندِ گریباں چاک اس دُنیا میں جو
کچھ نہیں کہتا پہ تقدیریں پلٹتا جائے ہے

"نگار" کے پچھلے فائل

(تمام فائل اکٹھا فروخت ہونگے)

سنہ ۲۶ء = ——— مئی تا اکتوبر ——— ۷ روپے
سنہ ۲۷ء = ——— جون تا نومبر ——— ۷ روپے
سنہ ۲۸ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ روپے
سنہ ۳۰ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ روپے
سنہ ۳۱ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ روپے
سنہ ۳۲ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ روپے
سنہ ۳۳ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ روپے
سنہ ۳۴ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ روپے
سنہ ۳۵ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ روپے
سنہ ۳۶ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ روپے
سنہ ۳۷ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ روپے
سنہ ۳۸ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ روپے
سنہ ۴۵ء = ——— جولائی تا اکتوبر ——— ۴ روپے
سنہ ۴۶ء = ——— جنوری تا نومبر ——— ۱۱ روپے
سنہ ۴۸ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ روپے
سنہ ۵۳ء = ——— جولائی، اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر ——— ۵ روپے

منیجر نگار لکھنؤ

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج)

ضخامت کتاب ۵۰۸ صفحات۔ تقطیع بڑی۔ قیمت ۷ روپیہ ۸ آنے۔

ملنے کا پتہ:- کتابستان - الہ آباد

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بے مثل گلدستہ ہے۔ آغازِ عشق سے انجامِ عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں اُن کے متعلق سرخیاں قایم کی گئی ہیں اور چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ہر سرخی کے تحت میں تقدم اور تاخر کے لحاظ سے درج ہیں۔ مراحلِ محبت کی سرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بھی سُرخیاں قایم کی گئی ہیں۔ سرخیاں سیکڑوں ہیں۔ اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ ہے درج ہے۔ اساتذہ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔ اُردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔

توقیت

تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ توقیت مرتب کی تھی جس میں ۱۵۱ھ سے ۹۳۲ھ تک کے تمام اہم تاریخی واقعات بتصدیق ہجری یکجا کر دئے گئے ہیں۔ تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

گاہے گاہے باز خواں ——— !

اسلام کا صحیح نظریہ

میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیم پر غور کیا ہے اس میں کوئی تنگ نظری ایسی نہیں ہے جیسی آج کل مسلمانوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس نے عوائد و مراسم کی بیخکنی کرکے صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے، اور بتایا ہے کہ حقیقتاً مسلمان وہی ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔

سب سے پہلی غلطی جو مذہب کے باب میں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ کفر و اسلام اور شرک و توحید کے مفہوم کے امتیاز میں ہوتی ہے اور چونکہ یہ غلطی صدیوں سے چلی آرہی ہے اس لئے اس کا دور ہونا آسان نہیں ہے، تاہم چونکہ اس وقت بات آپڑی ہے اس لئے مجبور ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ پر روشنی ڈالوں۔

انسان و خدا یا خالق و مخلوق کا جس حد تک یا جیسا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کرسکتا کہ خالق اور خدا کی ذات بالکل بے نیاز ہے، اور انسان کی کوئی بدعنوانی، کوئی نامعقولیت، یہاں تک کہ بتوں کو پوجنا بھی اس کو کوئی مضرت نہیں پہونچا سکتا اس کی برہمی نہ انسان کی سعی برہمی ہے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہونچتی ہے اور وہ خفا ہوجاتا ہے اور نہ اس کی مسرت ہماری مسرت ہے کہ کوئی امر مفید کسی سے ظاہر ہوا، اور ہم اس سے خوش ہوگئے۔

چونکہ خدا کی ذات ہمارے فلسفۂ مسرت و الم سے بلند ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی خوشنودی یا برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہوگا پھر اس مفہوم کی جب جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے، وہ ہماری بہتری سے متعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ ہماری مضرت سے ہے۔ اس لئے ظاہر ہوا کہ خدا کا منشا صرف یہی ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے فلاح و اصلاح کی تدبیر اختیار کرے جیسا کہ ——— "اِن اُرید اِلّا الاصلاح" سے ثابت ہوتا ہے اور ان مکارم اخلاق سے آپ اپنے کو آراستہ کرے، جو تمام نوع انسانی کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آپ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر کفر و اسلام، شرک و توحید کے مفہوم پر غور کریں گے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اسلام و توحید نام ہے صرف "استقامۃ فی العمل" کا بلندی اخلاق کا، اخوت عامہ کا اور کفر و شرک کہتے ہیں، نظم و نسق سے منحرف ہوجانے کو، ترک عمل کو، انحطاطِ اخلاق کو، انتشار و افتراق کو، فرقہ بندی کو، تفریق جامعۂ انسانیت کو اور انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو۔ کلام مجید کی یہی تعلیم ہے اور رسول چونکہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے آئے تھے اسی لئے ان کو "کافۃ للناس" اور "رحمۃ للعالمین" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ رسول نے فرقہ بندی کے خلاف اور تفریق مذاہب کے باوجود "اخوت عامہ" کے موافقت میں جو کیا یا کہا اس کا ثبوت کلام مجید سے ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"قل آمنا باللہ و ما اُنزل علینا و ما اُنزل علیٰ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب و الاسباط و ما اوتی موسیٰ و عیسیٰ و النبیّون من ربھم لا نفرق بین احد منھم و نحن لہ مسلمون"۔ پھر کیا نبیوں میں آپ رام۔ کرشن۔ بودھ کنفوشس وغیرہ کو شامل نہیں کرتے، کیا ان کی نبوت سے کسی کو انکار ہوسکتا ہے "ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا" (ہم نے ہر قوم میں کوئی نہ کوئی نبی مبعوث کیا) ارشاد خداوندی ہے۔ پھر اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ "و نحن لہ مسلمون" میں دنیا کے تمام ممالک و مذاہب کو شامل نہ کیا جائے۔

کلام پاک کے متعدد مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشاء خداوندی یہی ہے کہ ساری دُنیا ایک جماعت، ایک امت ہوکر زندگی بسر کرے اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں۔ "ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن لیضل من یشاء ویہدی من یشاء ولتسئلن عما کنتم تعلمون"۔

"ولو شاء اللہ" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "اگر اللہ چاہتا"، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تم سب کو ایک امت بنادے — لیکن وہ گمراہ کردیتا ہے اس کو جو اپنی گمراہی چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اُس کو جو اپنی ہدایت چاہتا ہے۔ لیکن اے لوگو تم مطمئن نہ رہو خدا تم سے ضرور باز پرس کرے گا۔ تمھارے افعال و اعمال پر وہ تم سے پوچھے گا کہ کیوں تم نے ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو اختیار کیا اور کیوں تم نے اپنے عمل سے اپنی وسعتِ نظر سے اپنے رواداری سے اور اپنے اصول زندگی سے اس "اخوت عامہ" کو دُنیا میں پیدا نہیں کیا جو خدا کے نزدیک محبوب ہے۔ "یضل من یشاء ویہدی من یشاء" کے معنی بعض مفسرین و مترجمین نے صحیح نہیں کئے ہیں اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی انھوں نے "یشاء" کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے، حالانکہ حقیقتاً "یشاء" کا فاعل "من" ہے کیونکہ آپ یہ معنی مراد نہ لیں گے تو پھر "ولتسئلن عما کنتم تعلمون" بالکل بیکار ہوجائے گا۔ کیوں کہ جب ہدایت و گمراہی صرف خداداد بات ہوگئی تو باز پرس کیوں اور کس سے؟

کلام پاک میں اسلام کے صحیح مفہوم کو ایک جگہ نہایت ہی پاکیزہ انداز میں بیان فرمایا ہے اور اس کی وسعت و ہمہ گیری کو اس انداز میں ظاہر کیا گیا ہے:- "صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عابدون"۔

یعنی اے رسول لوگوں سے کہدو کہ ایمان و اسلام جس چیز کا نام ہے وہ تو وہی اتحاد و یکرنگی ہے جسے ہم خدائی رنگ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس رنگ سے بہتر کون رنگ ہوسکتا ہے۔ اس لئے اسلام کی دعوت جن مختصر الفاظ میں کی گئی ہے اور جس آسانی کے ساتھ تمام افتراق و انتشار کو مٹانے کی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ:-

"قل یا اہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا نتخذ بعضنا بعضا ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشہدوا بانا مسلمون"۔

پس اسلام نام ہوا صرف اس کا کہ سوا ذاتِ خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کیجائے اور نہ کسی اور ہستی کو اس کا مقابل سمجھا جائے۔ یہ تعلیم اسقدر سادہ، اس درجہ آسان اور ایسی قریب الفہم ہے کہ گمراہ سے گمراہ قوم بھی اس کی مخالفت نہیں کرسکتی۔ ایک سوال اس جگہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی عبادت کرانے کا کیوں اس قدر شوق ہے اور وہ شرک و کفر یا جحود و انکار سے کیوں اس درجہ برہم ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسی کے سمجھنے پر صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کے سمجھنے کا انحصار ہے۔

یہ پہلے عرض کرچکا ہوں کہ خدا کی ذات اس تاثر سے بے نیاز ہے جو ایک انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اسکی برہمی یا خوشی کا مفہوم انسانی مضرت و منفعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے، انسان کا خواہ انفرادی حیثیت سے ہو یا اجتماعی لحاظ سے کسی ایسے امر کا مرتکب ہونا جو اخوت عامہ کو صدمہ پہونچانے والا ہو جو اجتماعیت عالم کو برباد کرنے والا ہو، جو مرکز انسانیت سے انحراف کرنے والا ہو، جس سے اشتراکِ عمل تباہ ہوتا ہو اور جس سے رشتۂ تمدن اور شیرازۂ تعاون کمزور ہوجانے والا ہو، شرک و کفر ہے، جحود و انکار ہے، بُت پرستی ہے اور ہر وہ چیز ہے جس کو غیر خدا کی پرستش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ایسا کرنا منشاء و حکم کے خلاف کرنا اس کی اہمیت سے انکار کرنا ہے، اس کے وجود کو نظر انداز کردینا ہے۔ اس کی مخالفت پر آمادہ ہونا ہے — اسی پر آپ اسلام و توحید کے مفہوم کا بھی قیاس کرسکتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ نہ اذان سے خدا کو فایدہ پہونچتا ہے نہ ناقوس سے کوئی نقصان نہ مسجد سے خدا کو کوئی راحت ملتی ہے نہ کلیسا اور مندر سے کوئی تکلیف۔

اگر ایک شخص غیر مسلم یعنی موجودہ جماعت اسلامی کا فرد ہونے کے باوجود تمام انھیں مکارم اخلاق اور محاسن فطرت سے آراستہ ہے۔ جن کی محمدؐ نے تعلیم دی ہے تو کیا آپ اس کو صرف اس لئے کہ وہ آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہے، کافر و مشرک کہکر ناری و جہنمی کہدیں گے اور دوسرا شخص

جو آپ کی جماعت کا فرد ہے، لیکن حد درجہ ظالم، بے رحم، مجرم اور شقی تو کیا اس کو صرف اس بنا پر کہ اس کا نام آپ ہی کی طرح ہے، آپ کے اعزہ میں اس کا شمار ہوتا ہے، نجات و فردوس کا پروانہ دیدیں گے۔

ایک بے رحم قزاق قافلہ کے قافلہ کو تباہ و برباد کرکے متعدد بے گناہ جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرکے فارغ ہوتا ہے کہ دفعتاً مغرب کی اذان ہوتی ہے، وہ فوراً اپنے ہاتھ اور دامن سے خون کے دھبے دور کرکے نماز میں مشغول ہوجاتا ہے۔ دوسرا شخص جو تمام دن دھوپ میں محنتِ شاقہ برداشت کرکے اپنے متعلقین کے لئے حلال روزی فراہم کرتا ہے۔ گاؤں کے بچوں، بوڑھوں، یتیموں اور بیواؤں کی خدمت کے لئے اپنی محنت، دولت، زندگی سب کچھ وقف کئے ہوئے ہے، لیکن شام کو وہ نماز پڑھنے کے بجائے ناقوس پھونکتا ہے، مسجد جانے کے بجائے وہ مندر کا رُخ کرتا ہے۔

اب آپ ایک مسلمان مولوی سے ایک متعصب مدعی اسلام سے دریافت کیجئے۔ وہ نہایت آزادی سے بلا پس و پیش کہدے گا کہ بہرحال اس قزاق کو نجات ملنی ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اس دوسرے کو آخرکار دوزخ میں جانا ہے کیونکہ اس نے بُت پرستی کی اور اسلام کو قبول نہیں کیا پھر اگر اسلام نام اسی وسعت نظر و انصاف کا ہے، اگر "صراط مستقیم" اسی کو کہتے ہیں اگر "فامرہم بالقسط" کا یہی مفہوم ہے۔ اگر دینِ محمدی کا یہی مدعا ہے تو میں مشورہ دوں گا کہ آیئے آپ بھی میرے ساتھ کافر ہوجایئے کیونکہ پھر تو خدا کفر ہی میں تلاش کرنے سے ملے گا۔

مسلمانوں کا یہ یقین کرلینا کہ صرف خدا انھیں کا ہے اور دوسری قوموں کو اس نے صرف دوزخ کا ایندھن بنانے کے لئے پیدا کیا ہے ایسا لغو و مہمل اعتقاد ہے جو کسی ذی فہم کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوسکتا اور نہ اس تعلیم کے ساتھ ہم کسی کو اپنی طرف مایل کرسکتے ہیں اسی لئے میں نے کہا کہ جہاں تک نفس تعلیم مذہب کا تعلق ہے، مسجد و کلیسا، ناقوس و اذان میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر ان دونوں جگہ مقصود خدا کی عبادت اور اصلاح اعمال ہے۔

آپ جب تک اس رواداری سے کام نہ لیں گے، جس وقت تک خیال میں یہ وسعت نہ پیدا ہوگی آپ کیونکر دوسروں سے توقع کرسکتے ہیں کہ وہ آپ کی جماعت میں شریک ہوجائیں گے۔ آپ تو ناقوس کی آواز سن کر لاحول پڑھنے لگیں۔ لیکن دوسرا آپ کی اذان کو سن کر سر بسجود ہوجائے باجہ بجانا چھوڑ دے۔ کیوں؟ آپ میں آخر وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے آپ کو خدا کا بیٹا بنا دیا ہے اور دوسرے کو گروہ شیطان و طاغوت میں داخل کردیا، آپ کیوں خدا کی ذات کو اپنے اندر محدود سمجھتے ہیں، اس کی صفت خلق و ربانیت کو اپنے لئے کیوں مخصوص جانتے ہیں بحیثیت انسان ہونے کے ہر شخص خواہ وہ عیسائی ہو یا ہندو چینی ہو یا بدھ، معتزلہ ہو یا اشعریہ، ناصبی ہو یا خارجی، شیعہ ہو یا سنی، خدا کے نزدیک ایک ہے، اس کا سب سے ایک ہی مطالبہ ہے، پھر جو اس کو پورا کرے گا خدا اسی کو ترقی و فلاح دے گا اور جو اس کو ترک کرے گا خدا بھی اس کو چھوڑ دے گا۔

بے شک یہ میرا ایمان ہے کہ مذہب اسلام یعنی وہ مذہب جسے محمدؐ نے پیش کیا، یقیناً بہترین ذریعہ تصفیۂ اخلاق اور تزکیۂ نفس کا ہے اور اس لئے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے لیکن میں اس کی اشاعت کو اس طرح پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذہب کو بُرا کہوں جبکہ مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ بھی سب سچے ہیں۔

آپ اگر ایک ہندو کو تعلیم اسلام دینا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کے ارکان پر ناک بھوں چڑھائیں، اس کی طریق عبادت پر نکتہ چینی کرنے لگیں بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ اس کو نفس مقصود و مذہب سے آگاہ کرکے آمادہ کریں کہ وہ اپنے طریق مذہب کے ساتھ ہی ساتھ مذہب اسلام کو بھی دیکھے اور خود فیصلہ کرے کہ منزل تک پہونچانے کا سب سے زیادہ آسان اور سیدھا راستہ کون سا ہے اور میری رائے میں "جادلھم بالتی ہی احسن" کا بھی یہی مفہوم ہے۔

آپ اگر اپنی حرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حرمت کیجئے۔ یہ عام اصول اخلاق کا ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مذہب کا وقار قائم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذاہب کی بھی عزت کیجئے۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اور نہ قوت و جبر سے کوئی مذہب اشاعت پذیر ہوسکتا ہے۔ تلوار

ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہے وضع و معاشرت میں تو تبدیلی پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی، دماغ کو نہیں مجبور کر سکتی ہے۔ اطمینانِ نفس طمانیت روح، لطف و رافت، محبت و شفقت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے، جس کے ثبوت میں اسوۂ نبوی آپ کے اور ہمارے سب کے سامنے موجود ہے اور یہ چیز مسلمانوں کے پاس ایسی عظیم المرتبت، ایسی جلیل القدر ہے کہ اس کے سامنے سوا سر عجز جھکا دینے کے اور کوئی چارۂ کار نہیں۔ پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ جو حقیقی دولت آپ کے پاس ہے، اُسے تو آپ پیش نہیں کرتے، دکھاتے ہیں خزف ریزوں کو اور دُنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ انھیں کو جواہر ریزے سمجھے۔

پھر چونکہ یہ تنگ نظری نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ دُنیا کے تمام مذاہب کے مقلدین میں پائی جاتی ہے اس لئے جو اعتراض میرا اہلِ اسلام پر ہے، وہی ہندوؤں پر ہے اور وہی دوسرے مذہب والوں پر۔ نہ ہم میں رواداری، نہ ان میں انصاف، نہ ہم صراط مستقیم پر، نہ وہ راہ راست پر منزل سے بعید ہونے میں سب کا ایک درجہ ہے اور گمراہی میں مبتلا ہونے کے لئے سب یکساں طور پر حریص ہیں۔

یہ میرا اعتقاد و یقین مذہب کے متعلق جسے میں نے صاف صاف الفاظ میں ظاہر کر دیا اور متقدمین کی تعلیم اس کی منافی ہے تو میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں، جس طرح میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ میرے قول کو صحیح سمجھ لیں۔ لیکن اگر موجودہ حالت قایم رہی اور رہے گی تو باور کیجئے کہ ایک زمانہ آئے گا جب تمام مذاہب محو ہو جائیں گے اور وہی وقت تجدید اسلام و احیاء دین محمدی کا ہوگا۔

ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

نگار کے پچھلے فایل

سنہ ۳۲ء	=	جولائی تا دسمبر	= ——— =	۸ے
سنہ ۳۶ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ ہندی شاعری نمبر) =	۱۵ے
سنہ ۳۷ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ اصحاب کہف و خلافت نمبر) =	۱۵ے
سنہ ۳۹ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ مصحفی نمبر) =	۱۵ے
سنہ ۴۰ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ نظیر نمبر) =	۱۵ے
سنہ ۴۴ء	=	جولائی تا دسمبر	= ——— =	۸ے
سنہ ۴۶ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ انتقاد نمبر) =	۱۵ے
سنہ ۴۷ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ ماجد و لین نمبر) =	۱۵ے
سنہ ۴۹ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ افسانہ نمبر) =	۱۵ے
سنہ ۵۰ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ تنقید نمبر) =	۱۵ے
سنہ ۵۲ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ حسرت نمبر) =	۱۵ے
سنہ ۵۳ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ داغ نمبر) =	۱۵ے

نوٹ :- صرف ایک ایک فایل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

مشکلاتِ غالب

(بہ سلسلۂ ماہ جون ۱۹۵۸ء)

غزل (۲۰۶)

۱۔ ازبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے کشادہ بستہ مژہ سیلیِ ندامت ہے

چونکہ حسن کا بار بار تماشہ کرنا، سراسر دیوانگی ہے، اس لئے وقت تماشا میری پلکوں کا بار بار کھلنا اور بند ہونا گویا ایسا ہے جیسے شرم و ندامت مجھے تھپڑ مار رہی ہو، مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ تماشائے حسن کا نتیجہ ندامت کے سوا کچھ نہیں۔

۲۔ نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی، تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

اغیار سے ملنے کے لئے معشوق آئینہ کے سامنے محوِ آرائش ہے، لیکن یہ بھی سوچتا جاتا ہے کہ میرا ایسا کرنا غالب سے بدعہدی ہوگی اور اس خیال کے زیرِ اثر وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ آئینہ بھی اس کو ملامت کر رہا ہے۔ تکلف و آورد کے سوا اس شعر میں کچھ نہیں۔

۳۔ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

امن و عافیت اسی میں ہے کہ حرص و ہوس کو چھوڑ دیا جائے۔

۴۔ وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

باوجود اس کے کہ اغیار کا دعوائے عشق بے بنیاد ہے، لیکن تو پھر بھی وفا پر آمادہ ہے، اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص جنون و دیوانگی کی مصنوعی کیفیت اپنے اوپر طاری کرلے اور فصلِ گل سے لطف حاصل کرے۔

(غزل نمبر ۲۰۷ صاف ہے)

غزل (۲۰۸)

۴۔ ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے آگے گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

جب میں صحراؤ نوردی میں خاک اڑانے پر آجاتا ہوں تو خود صحرا اس گرد میں چھپ جاتا ہے اور جب اشک باری شروع کردیتا ہوں تو دریا بھی مجھ سے عاجز آجاتا ہے۔

---

۱۱ - خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

شبِ ہجراں میں ہم موت کی تمنا کرتے تھے، لیکن موت نہ آئی۔ اب شبِ وصل میں یہ تمنا اس طرح پوری ہوئی کہ شادی مرگ ہو

غزل (۲۰۹)

۸ - رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجئے کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے

اس شعر میں اور اس سے پہلے کے چند اشعار میں زمانہ کے نامساعد حالات کا ذکر کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے .....

..... کہ زمانہ کا چلن کتنا الٹ گیا ہے اور ظلم کی داد کہیں نہیں ملتی یہاں تک کہ اگر قاتل جان لے تو اس سے خوں بہا لینے کی جگہ الٹا خوں بہا دینا پڑتا ہے اور زبان کاٹنے والے کو مرحبا و آفریں کہنا پڑتی ہے۔

غزل (۲۱۰)

۱ - رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

"دھوئے گئے" (بے شرم و بے حجاب ہو گئے)

ہم نے محبت میں اشکباری سے اس لئے کام نہیں لیا تھا کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو، لیکن آخر کار جب ضبط باقی نہ رہا اور آنسو جاری ہو گئے تو یہ ساری احتیاط ختم ہو گئی اور مسادی دنیا پر یہ راز ظاہر ہو گیا۔

غزل (۲۱۱)

۱ - نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب شیشۂ مے سرو سبز و جوئبار نغمہ ہے

غالب نے اس شعر میں محفلِ طرب کی مسرت و نشاط کا ذکر کیا ہے کہ ہر شخص نشہ میں چور ہے، مطربوں کے ساز سے مستی ٹپک رہی ہے شیشۂ شراب سرو نظر آتا ہے اور نغمہ جوئبار کی طرح جاری ہے۔

---

۲ - ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

اگر میں دوست کی محفل عیش و مسرت میں نالہ کرتا ہوں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے بزمِ محبوب میں کوئی تلخی یا برہمی پیدا ہوتی ہے، کیونکہ میرے نالہ سے بھی وہاں نغمہ کا سا لطف اٹھایا جاتا ہے۔

غزل (۲۱۲)

۱ - عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے دعوئے جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

جب معشوق از راہِ شوخی ہنستا ہے تو اس کے دانت نمایاں ہو جاتے ہیں، اسی طرح احباب کے یکجا ہو جانا بھی ہنسی کی بات ہے

کیونکہ اس جمعیت کا کیا اعتبار۔ اس شعر میں محبوب کے دانتوں کو ایک دوسرے سے ملے ہوئے دیکھ کر جمعیتِ احباب کی طرف خیال منتقل ہوا۔

۲۔ ہے عدم میں غنچہ محوِ حیرتِ انجام گل یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

"یک جہاں زانو تامل" ۔ (تاملِ بسیار) کیونکہ فکر کے وقت انسان زیادہ تر زانو پر سر رکھ کر سوچتا ہے، مفہوم یہ ہے کہ غنچہ ہنوز حالتِ عدم میں ہے لیکن وہ سوچ رہا ہے کہ اس کا انجام بھی یہی ہونا ہے کہ وہ غنچہ سے پھول بنے اور پھر فنا ہو جائے۔

۳۔ کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام، ورنہ دنداں در دلِ افشردن بنائے خندہ ہے

عیشِ بیتابی ۔ (وہ لطف جو بیتابی سے حاصل ہو) ۔ دنداں در دل افشردن ۔ (تکلیف و مصیبت کو برداشت کرنا)۔
افسردگی کے عالم میں ہم بیتابی کا اظہار حرام سمجھتے ہیں ورنہ تکالیف کے تحمل کے لئے اگر ہم اپنے دل کو دانتوں سے زخمی کر دیں، تو اس سے ایک کیفیت خندہ ضرور پیدا ہو سکتی ہے۔
اس شعر میں فارسی محاورہ "دنداں در دل افشردن" سے ابہام پیدا کر کے انتہائی دور از کار استعارہ سے کام لیا گیا ہے۔

۴۔ سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

بظاہر احباب یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں سوزشِ باطن نہیں پائی جاتی، لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں۔ بظاہر میرے لب آشنائے خندہ نظر آتے ہیں لیکن دل پر سیلِ گریہ طاری ہے۔

غزل (۲۱۳)

۱۔ حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے آئینہ، زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

"خریدارِ متاعِ جلوہ"۔ (جلوہ کا خواہشمند)
حسن بظاہر بے پروا نظر آتا ہے لیکن نت نئے جلوؤں کی فکر سے غافل نہیں اور ہر وقت آئینہ کے سامنے اسی غور میں مبتلا رہتا ہے کہ وہ کس آرائش سے کام لیکر اپنے جلوؤں کو فروغ دے۔ آئینہ کو زانوئے فکر اس لئے کہا کہ جس طرح فکر کے وقت زانو پر سر رکھ کر سوچا جاتا ہے اس طرح وہ جلووں کی افزائش کے لئے آئینہ سامنے رکھ کر غور کرتا رہتا ہے۔

۲۔ تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن، چشم وا گردیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

"رنگِ تماشا باختن" (مصروفِ تماشہ رہنا)
"چشمِ وا گردیدہ" (کھلی ہوئی آنکھ)
اے آگاہی تو کب تک جلوۂ ظاہر کے تماشہ میں مصروف رہے گی، حالانکہ اس تماشہ کے لئے آنکھ کا کھلنا ہی وداعِ جلوہ ہے یعنی آنکھ جتنی زیادہ کھلے گی، اتنی ہی زیادہ یہ حقیقت واضح ہوگی کہ دنیا کے ظاہری جلوے بالکل بے بنیاد ہیں۔

غزل (۱۱۴)

۲- عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سربسر — کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

دُنیا کو طرۂ لیلیٰ کے نقطۂ نظر سے کب تک دیکھا جاسکتا ہے جبکہ وہ دراصل وحشت مجنوں کی غبار انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔ مدعا یہ کہ دُنیا میں ناکامی وحشت ہی اصل چیز ہے اور ظاہری نمود و نمایش بالکل بے بنیاد چیز ہے۔

۸- ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست — نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

سودائے جنون نقصان کا سودا نہیں کیونکہ اس عالم میں ہر سنگ و خشت جو لڑکے دلوانوں کو مارتے ہیں اس کے لئے صدف کا حکم رکھتے ہیں، جس سے گوہرِ شکست حاصل ہوتا ہے۔

۱۰- ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز — یہ درد وہ نہیں ہے کہ پیدا کرے کوئی

یاس ؛ (نومیدی - ایک پھول کا نام بھی ہے)

طبعِ ایجاد پسند کی وحشت کا نتیجہ ہمیشہ یاس و نومیدی ہوا کرتا ہے، اس لئے ایسے لوگوں میں دردِ نومیدی پیدا ہونا لازم ہے۔

(غزل نمبر ۲۱۵ و ۲۱۶ صاف ہیں)

غزل (۲۱۷)

۲- جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم — ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے

جس طرح تلوار میں جوہر پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ تیزاب (زہر آب) سے کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح میری حالت بھی اس سبزہ کی ہے جو زہر آب سے نشو و نما پاتا ہے - مدعا یہ کہ میری فطرت ہی یہ ہے کہ زہرِ غم سے آسودہ ہو۔

۳- مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے، — آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

ہمارا مدعا یہی تھا کہ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور ہم شکستِ دل کے تماشہ میں محو ہو جائیں، چنانچہ اب ہماری حالت ایسی ہے جیسے کسی کو آئینہ خانہ میں لے جائیں اور ہر طرف اسے اپنی ہی صورت نظر آئے۔

۴- نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک — آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے،

قمری بھی خاکی رنگ کی ہوتی ہے اور قمری کا انڈا بھی خاکستری ہوتا ہے، اس لئے آسمان کو بیضۂ قمری قرار دیا اور عالم کو کفِ خاک - چونکہ دُنیا نام نالہ و زاری اور خاک اُڑانے کا ہے اس لئے آسمان گویا بیضۂ قمری ہے (جو خاکی رنگ کا ہوتا ہے) قمری کی آواز کو بھی نالہ ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔

کس کا شعر ہے ؟

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

(جمیل اختر رام پوری) ۲۱ مئی ۱۹۵۷ء

مکرمی - تسلیم - اس سے قبل آپ کو شعر معلوم یعنی وہ آئے بزم ..... الخ کے متعلق دو خط روانہ کر چکا ہوں اور جہاں تک میری رائے خیالات کا تعلق تھا وہ آپ پر بخوبی واضح ہو گئے ہوں گے۔ اب چند باتیں اُسی سلسلہ میں اور لکھنا چاہتا ہوں۔ سب سے اول تو میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ جناب راز نے مجھے بی۔ اے فائنل کا طالب علم بتایا ہے حالانکہ میں نے اس سال (B.A. Part First.) بی۔ اے پارٹ فرسٹ کا امتحان دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اُنھوں نے میرے حوالہ سے اپنے خط میں یہ بات لکھی تھی کہ میں شعر زیر بحث کو میر محمد تمیر کے شاعر سے منسوب کرتا ہوں حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ جب آپ نگار میں ایک نوٹ کے ساتھ یہ شعر شایع کیا تو میں نے انھیں ٹوکا اور اپنی رائے کا اظہار کیا اور اسی ذیل میں یہ بھی کہا کہ شاید یہ شعر تمیر نام کے کسی دوسرے شاعر کا ہو۔ اسی سلسلہ میں میں نے جناب قاضی عبدالودود صاحب سے اس امر کی تصدیق چاہی تو اُن کا جواب نفی میں آیا اور اُس سے میں نے جناب راز کو بھی مطلع کر دیا، لیکن شاید وہ آپ کو اس سلسلہ میں پہلے خط لکھ چکے تھے۔ بہر حال میرا یہ دعوے نہیں کہ یہ شعر میر محمد تمیر نام کے کسی شاعر کا ہے کیونکہ اس نام کے شاعر سے میں قطعاً ناآشنا ہوں۔ اسی شعر کے متعلق ایک تازہ تحقیق اور سنئے اور وہ یہ کہ جناب وحشت کلکتوی نے جن کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اپنی ایک غزل کے مقطع میں جو شعر زیر بحث ہی کی بحر اور زمین میں ہے۔ مصرعۂ ثانی کو میر تخلص کے ساتھ استعمال کیا ہے :-

؎ یہ کس کی جلوہ نمائی ہے بزم میں وحشت بقول میر چراغوں میں روشنی نہ رہی

اگر وحشت مرحوم زندہ ہوتے تو اُن سے اس شعر کے ماخذ کا پتہ چل سکتا تھا اب اُن کے شاگردوں اور احباب یعنی پروفیسر جمیل مظہری - ارشد کاکوی اور عندلیب شادانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے کیونکہ وحشت مرحوم نے یہ شعر اُنھیں یقیناً سنایا ہوگا اور ممکن ہے اس پر کچھ بحث بھی ہوئی ہو۔ ادھر چند یوم ہوئے جناب راز نے مذکورۂ بالا شعر ایک معمولی ترمیم کے بعد اس طرح سنایا ہے ؎ اُن کو جاتے تو میر دیکھا تھا ؛ پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی اور یہ کہا کہ اُن کے ایک دوست مولوی امتیاز کا کہنا ہے کہ نگار نومبر ۱۹۵۲ء میں آپ کا مصرعہ طرح اسی شعر سے ماخوذ ہے، مجھے تلاش کے باوجود نگار نہ مل سکا۔ یہ امر بھی قابلِ تحقیق ہے۔ زیادہ والسلام۔

(حیات دہلوی - بی۔ اے - آنرز) حیدر آباد سندھ پاکستان - ۲ جون ۱۹۵۷ء

مکرم و معظم بندہ - سلام مسنون - "وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے دیکھا ؛ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی"

مندرجۂ بالا شعر کے متعلق "نگار" میں خط و نظر سے گزرے۔ تعجب ہے کہ ہلکی باتیں کس طرح کہی جا رہی ہیں۔ میرے پسندیدہ اشعار کی ایک بیاض ہے جس میں قریب دو ہزار اشعار میں نے درج کئے ہیں۔ یہ شعر بھی بیاض میں ہے اور تاریخ اندراج ۱۱ اگست ۱۹۳۹ء ہے۔ دہلی کے کسی مشاعرہ میں ایک صاحب عشرت مراد آبادی سے ملاقات ہوئی تھی ان کا قیام بلی ماران میں کسی صاحب کے پاس تھا۔ یہ غزل انھوں نے سنائی تھی حسب قبل اشعار میں نے پسند کئے جو آج تک محفوظ ہیں :-

تڑپ تڑپ کے کبھی تو سکون آجاتا دلِ تباہ پہ تیری نگاہ بھی نہ رہی

اُلجھ کے رہ گئی دنیا نظر کے دھوکوں میں ترا جمال جو دیکھے وہ آنکھ ہی نہ رہی

وہ آئے بزم میں اتنا تو یاد ہے عشرت پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

مہربانی فرما کر میرا خط شایع فرما کر اس غلطی کو دور فرما دیں۔ میں صحیح طور پر عرض نہیں کر سکتا۔ مگر سنا ضرور ہے کہ وہی عشرت صاحب لاہور یا بھاولپور میں کہیں مقیم ہیں۔ میں لاہور کے پرچوں کے ذریعہ ان کا پتہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کروں گا تاکہ ان کی اپنی تحریر اس کا قطعی فیصلہ کر سکے۔

پاکستان کے متعلق میرے لئے کوئی خدمت ہو تو یاد فرمائیں۔

خمارِ گمرہی

(فضا ابن فیضی)

ابھی رنگیں نہیں میری سحر کا پیرہن ساقی ادھر بھی آفتابِ تازہ کی کوئی کرن ساقی
کہ پھیلے ہیں اندھیرے انجمن در انجمن ساقی

مقدر میں نہیں آنکھوں کا نہیں مانوسِ نظر ہونا بہت دشوار ہے شائستۂ نورِ سحر ہونا،
اندھیرے سے اُلجھ کر ٹوٹ جاتی ہے کرن ساقی

لہو روتی ہے اب چشمِ تبسم آفریں ساقی نسیمِ صبح چنتی ہے خزاں کی آستیں ساقی
سلگتا ہے ابھی سوزِ بہاراں سے چمن ساقی

ابھی یاس و جنوں کی ہے وہی گہوارہ جنبانی سفینوں کی بلائیں لے رہا ہے نازِ طغیانی
ابھی زلفِ حوادث ہے شکن اندر شکن ساقی

گرفتِ تیرگی مضبوط ہے میرے سویروں پر مگر کچھ زور چلتا ہی نہیں ظالم اندھیروں پر
کہ سیتی ہے سحر خود اپنے سورج کا کفن ساقی

ابھی تو زخم میں پیدا نہیں سوزِ جگر تابی ابھی تو ڈھونڈھتی ہے عقل درمانِ گرانخوابی
ابھی طاری ہے اعصابِ زمانہ پر تھکن ساقی

غلامی کا نشہ اُترا نہیں کتنے دماغوں سے وہ پروانے ابھی تک دور ہیں اپنے چراغوں سے
ہوئی تھی گرم جن کے سوزِ دل سے انجمن ساقی

اجالوں پر گمانِ دوزخِ ظلمات ہے ساقی ترے خورشید پر طاری کیسی رات ہے ساقی
یہ ظلمت پوش کیوں ہے صبحِ جلوہ پیرہن ساقی

سرایت کو گیا ہے زہرِ خود کامی ضمیروں میں ابھی تو قید ہے انساں گناہوں کے جزیروں میں
دھڑکتا ہے ابھی سینوں میں قلبِ اہرمن ساقی

ابھی اوہام سوتے ہیں یقیں کی خوابگاہوں میں جنوں ہے آج بھی سرمایۂ دانش نگاہوں میں
کفن پر آج بھی ہے اعتبارِ پیرہن ساقی

خلوصِ مے کی وہ چمک باقی نہیں دل کے نگینوں میں زبانوں پر خدا ہے اور بت ہیں آستینوں میں
برہمن بن گئے کتنے "خلیلِ بت شکن" ساقی

اٹھے ہیں رات کے فتنے سحر کی جلوہ گاہوں سے درندے بن کے انساں باہر آئے خانقاہوں سے
یہ عریانی ہے اپنی "خانہ زادِ پیرہن" ساقی

مری روحِ وطن سیراب بھی ہے اور پیاسی بھی "خمارِ گمرہی" ہے نشۂ منزل شناسی بھی
خضر کے بھیس میں پھرتے ہیں اب تک راہزن ساقی

شفقت کاظمی (رنگ حسرت) :-

وہ دل میں حرفِ شکایت کو راہ کیوں دیتے
تری جفا سے جنھیں بوئے دلبری آئی

مٹا کے آج ترے التفات کی امید
تری گلی سے چلے ہیں ترے تمنّائی

مری وفا کا صلہ اور کوئی دے نہ سکا
جفائے یار ہمیشہ بروئے کار آئی

نہ تھی کمی تری دُنیا میں راحتوں کی مگر
مرا نصیب کہ میں نے متاعِ غم پائی

کشاکشِ غمِ دوراں سے بے نیاز رہا
وہ دل کہ جس کو تری چاہ ساز گار آئی

ہمیں خود اپنی وفا سے نہ شرمسار کرے
بحالِ غیر تری التفات فرمائی

کریں گے عرض گزرتی ہے زندگی جیسے
ترے حضور میں قسمت اگر کبھی لائی

ترے دیار کی آبادیاں تھیں جن کے طفیل
خبر نہیں کہ کہاں گم ہوئے وہ سودائی

بڑے مزے میں گزرتی تھی زندگی شفقت
خوشا وہ عہد کہ اُن سے نہ تھی شناسائی

ربطِ باہم کا جو امکان نہ پایا ہم نے،
دل سے آخر تجھے اے دوست بھلایا ہم نے

سیکڑوں بار ہمیں یاد اُنہی کی آئی،
سیکڑوں بار جنھیں دل سے بھلایا ہم نے

کوئی اپنا رفیقِ سفر ہی نہ تھا
ہر قدم پر تجھے ہم پکارے گئے

تجھ کو جشنِ مسرت مبارک رہے
تیری محفل سے اب غم کے مارے گئے

اُن سے ملنے کی امید رکھیں نہ ہم
اب بہت دور ساتھی ہمارے گئے

آصف عارفی :-

کوئی مقامِ تعجب نہیں یہ میرے ندیم
کہ مستِ شیوۂ آذر ہے نسلِ ابراہیم

وہ جس کے فقر کے آگے تھی ہیچ ہفت اقلیم
قبول کر لی اُسی نے اطاعتِ زردیم

جنوں کی جلوہ طرازی ہے ماورائے نظر
خرد کی آخری منزل مشاہداتِ حکیم

اس اتحاد سے اللہ امان دے تجھ کو
کہ جس سے آدمی قوموں میں ہو گیا تقسیم

گرہ کشائی غنچہ خرد کے بس کی نہیں
جنونِ عشق کی منت پذیر ہے یہ شمیم

مشاہدہ کی طلب تھی تمام بے معنیٰ
جمالِ ذات سے واقف نہ تھی نگاہِ کلیم

شاد میرٹھی :-

کسی محفل میں ہوتی ہے نہ ایوانوں میں ہوتی ہے
وہ اک عظمت سی جو خاموش ویرانوں میں ہوتی ہے

اُلجھتی ہیں بہاریں خود بخود ان کے گریباں سے
کوئی خوبی تو آخر چاک دامانوں میں ہوتی ہے

دیارِ رنگ و نکہت سے گزر جاتے ہیں بے پروا
یہ شانِ بے نیازی صرف دیوانوں میں ہوتی ہے

ملی ہے شاد کو درویش سے وہ شانِ استغنا
جو سلطانوں میں ہوتی ہے نہ خاقانوں میں ہوتی ہے

غنی احمد غنی :-

ضبطِ غم کہتے ہیں جس چیز کو ارباب وفا
ایک خاموش سا اندازِ فغاں ہوتا ہے

ہائے رے غم کی لطافت نہیں ہوتا محسوس
چوٹ کھائی ہے کہاں درد کہاں ہوتا ہے

زندگی غم سے کچھ اس درجہ ہے مانوس کہ اب
دل پہ احساسِ مسرت بھی گراں ہوتا ہے

اختر تلہری :-

ذوقِ نظارہ گلشن کو تو حاصل ہے نشاط
بوئے گل محفلِ ہستی میں پریشاں ہی سہی

زندگی کو تو بہر طور بسر کرنا ہے
میری قسمت میں گلستاں نہیں زنداں ہی سہی

گریۂ و نالہ بدلتے نہیں نظمِ عالم،
تیرے اشکوں میں نہاں شورشِ طوفاں ہی سہی

اہلِ دل کے لئے یہ بھی ہے مداوا اختر
مرہمِ زخم نہیں ہے تو نمکداں ہی سہی

سعادت نظیر :-

شمع کتنا سوز رکھتی ہے؟ یہ پروانوں سے پوچھ!
سوختہ جانوں کا عالم سوختہ جانوں سے پوچھ!

جا بجا جوشِ جنوں کا ہے تصرف آج بھی
موسمِ گل کی حقیقت چاک دامانوں سے پوچھ!

یہ سبک ساران ساحل کیا بتائیں گے تجھے
کس نے طوفانوں کا رخ بدلا؟ یہ طوفانوں سے پوچھ!

مضطر حیدری :-

اظہارِ مدعا پر قابو کہاں ہے مضطر
جب بھی زباں رکی ہے آنسو نکل گئے ہیں

مکتوباتِ نیاز

(تین حصّوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دُور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصّہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

۵۵ سال کے بعد

ایک بے مثل نفسیاتی مطالعہ جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ۵۵ سال کے بعد مسرور زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے زبان و انداز بیان کے لحاظ سے یہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ناول کا سا لطف دیتی ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان کے ایک شاہکار کا ترجمہ ہے۔ قیمت ۱۲ (علاوہ محصول)

مالہ و ما علیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کا ثبوت انھوں نے دورِ حاضر کے بعض اکابر شعرا، مثلاً جوش، جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے، ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی انشا عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مؤرخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اُردو غزل گوئی پر عہد بہ عہد ترقی، نقش ہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون، اڈیٹر حقیقت نگاری۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات و بیماری شہرت و نیک نامی پر پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

RECD.N-A-466

رجسٹرڈ نمبر ۴۶۶۷ا

نگار کے خاص نمبر

سال نامہ ۱۹۲۸ء (مومن نمبر)

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از حد ضروری ہے۔ قیمت دو روپے چار آنہ (علاوہ محصول)

جنوری ۱۹۴۳ء (ریاض نمبر)

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک متعدد شاعیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ ار آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۸ء (پاکستان نمبر)

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے درخشاں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپے چار آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء (افسانہ نمبر)

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اصول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپے چار آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۱ء (مشرق وسطیٰ نمبر)

اس سالنامے کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں اڑس ہنڈی کی مشہور عالم کتاب 'ایک مستقبل کی تلاش' کا ترجمہ اقتباس ہے جس میں اس میں ایران، مصر، عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے۔ اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں، سالنامہ کو دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے چار آنہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی، حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۳ء (داغ نمبر)

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے اس نمبر میں قیام رامپور، حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء (فرماں روایان اسلام)

(فرماں روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے یہ سال نامہ در اصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء (علوم اسلامی نمبر)

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) مع تتمہ۔ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ (علاوہ محصول)

سال نامہ ۱۹۵۶ء (خدا نمبر)

خدا کا تصور عہد تاریک سے لے کر عہد حاضر تک۔ بے مثل تاریخی و تحقیقی تبصرہ مذاہب عالم پر۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ (علاوہ محصول)

سال نامہ ۱۹۵۷ء (اصناف سخن نمبر)

غزل۔ قصیدہ، مثنوی، رباعی، مرثیہ وغیرہ جملہ اصناف سخن پر ایک بیش بہا ذخیرہ معلومات۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ منیجر نگار لکھنؤ